کمیونسٹ

اور

مذہب

ظ۔ انصاری

کمیونسٹ اور مذہب

کمیونسٹ اور مذہب

ظ۔ انصاری

مکتبۂ شاہراہ، دہلی ۶

تعداد اشاعت :- ایک ہزار

پہلی بار :- فروری ۱۹۵۸ء

قیمت :- دو روپے

مجلد :- ~~۲ روپیہ آٹھ آنے~~

مطبوعہ جیّد برقی پریس بلیماران دہلی ۶

ترتیب

دیباچہ، پنڈت سندرلال ،
پیش گفت ،
اصل سوال ،
مذہب سماجی تاریخ کی روشنی میں ،
کمیونسٹ اور اخلاقیات ،
ٹکراؤ ہے یا نہیں ؟
مذہبی آزادی ،
آنکھوں دیکھی ،

دیباچہ

کمیونزم اور مذہب کے باہمی تعلقات پر کچھ دنوں سے کافی چرچا ہو رہا ہے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ کمیونزم اور مذہب دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور دنیا میں کمیونزم کے بڑھنے سے مذہب کو خطرہ ہے۔

اکثر لوگ الگ الگ مذہبوں میں یا اپنے مذہب اور دوسرے کے مذہب میں بھی اتنا زبردست تضاد دیکھتے ہیں کہ انھیں ایک کے بڑھنے میں دوسرے کو خطرہ نظر آتا ہے۔ اس طرح کے خیالات عام طور پر واقفیت کی کمی یا غلط فہمی پر مبنی ہوتے ہیں۔

پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ مذہب ہے کیا چیز۔ عربی لفظ "مذہب" کے لفظی معنی ہیں راہ یا راستہ۔ جس راستے پر انسان کو چلنا چاہیئے یا جس طرح سے زندگی بسر کرنی چاہیئے وہی انسان کا مذہب ہے۔ اس راستے کے بارے میں الگ الگ خیالات ہو سکتے ہیں اسی لئے دنیا میں الگ الگ مذاہب دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن غرض سب کی ایک ہے۔ انگریزی لفظ "ریلیجن" جس لاطینی مصدر سے نکلا ہے اس

کے معنی باندھنا ہیں۔ یعنی ریلیجن وہ چیز ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ اور کل انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھے رکھے۔ سنسکرت لفظ "دھرم" کے لفظی معنی دھارن کرنا یعنی سنبھالے رکھنا۔ جو چیز انسانی قوم کو سنبھالے یعنی ملائے رکھے وہی دھرم ہے۔ الگ الگ زبانوں کے اور جتنے الفاظ مذہب کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ان سب کا لگ بھگ یہی مطلب ہے۔

اب اگر ہم دنیا کے خاص خاص مذہبوں اور ان کی تعلیم کی طرف نگاہ ڈالیں تب بھی مذہب کا خاص مقصد ہمیں یہی نظر آتا ہے یعنی آدمی کو زندگی بسر کرنے کی ٹھیک راہ بتانا۔ دنیا کا سب سے حال کا مذہب اسلام ہے۔ قرآن میں مذہب کو "جھٹلانے والے" یعنی نہ ماننے والے ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو "یتیموں کی پرورش نہیں کرتے، مسکینوں کو کھانا نہیں دیتے اور اپنے ہمسایوں کی مدد نہیں کرتے"۔ یہاں تک کہ ایسے لوگوں کے نماز پڑھنے کو بھی قبیح یعنی بُرا بتایا گیا ہے (سورۃ ۱۰۷) حضرت محمد صاحب سے پوچھا گیا کہ اسلام کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ "زبان کی پاکی اور مہمان نوازی"۔ ان سے پوچھا گیا کہ ایمان کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا:۔ "صبر کرنا اور دوسروں کی بھلائی کرنا"۔ پوچھا گیا کہ سچا مومن کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ "جب تمھیں کسی کے ساتھ نیکی کرنے سے خوشی ہو اور بُرائی کرنے سے دُکھ ہو تو تم سچے مومن ہو"۔ پھر پوچھا گیا کہ گناہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ "جب کسی کام کے کرنے سے تمھارے ضمیر کو چوٹ لگے تو اسے نہ کرو"۔ حضرت محمد صاحب کی اس طرح کی حدیثیں اَنگنت نقل کی جا سکتی ہیں۔

اسلام اگر سب سے آخر کا مذہب ہے تو ہندو مذہب غالباً سب سے پُرانا

مذہب ہے۔ ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی ہمیں جگہ جگہ یہی چیز ملتی ہے۔ ہندو مذہب کے قائد اعظم منو مہاراج نے لکھا ہے:۔ "دھرم کی یہ دس پہچانیں ہیں مستقل مزاج ہونا، دوسروں کے قصوروں کو معاف کرنا۔ اپنے نفس پر حاوی رہنا، چوری نہ کرنا۔ پاک صاف رہنا، اپنے حواسِ خمسہ کو قابو میں رکھنا، سمجھداری سے کام لینا علم حاصل کرنا۔ ہمیشہ سچ بولنا اور غصہ نہ کرنا" مہابھارت میں دھارمک آدمی کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔ "جو آدمی ہمیشہ سب کا دل سے بھلا چاہتا ہے، اور سب کی بھلائی کے کاموں میں لگا رہتا ہے، اپنے فعل سے اپنے خیال سے اور اپنی زبان سے۔ وہی دھرم کا جاننے والا ہے" حضرت عیسیٰ کے اپدیشوں اور دوسرے مذہبوں کی کتابوں میں سے بھی اس طرح کی بے شمار چیزیں نقل کی جا سکتی ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا کے ہر رائج مذہب کے دو موٹے موٹے پہلو ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق عمل سے ہے اور دوسرا وہ جس کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ ہر مذہب کے ساتھ کچھ ایسے رسم و رواج بھی لگے ہوئے ہیں جو ایک طرح سے ان دونوں پہلوؤں کو ملانے کا کام کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک رسم و رواج کا تعلق ہے وہاں تک سب مذہبوں کی کتابوں میں یہ سچائی بار بار دہرائی گئی ہے کہ رسم و رواج اتنی ضروری چیز نہیں ہیں جتنی نیکی اور بدی یعنی دوسروں کے ساتھ اچھا یا برا برتاؤ۔ ہر مذہبی کتاب میں یہ بھی صاف کر دیا گیا ہے کہ ان تمام رسم و رواج کا اصل مقصد محض انسان کو نیکی کی راہ پر قائم رکھنا ہے۔ قرآن سب سے آخری مذہبی کتاب ہے اور نماز اور روزہ اسلام کے سب سے بڑے رکن ہیں قرآن میں یہ صاف کہا گیا ہے کہ نماز اور روزہ دونوں کی اول غرض یہی ہے

کہ لوگ بُرائی سے بچیں اور نیکی کی راہ پر چلتے رہیں۔"

اب رہا مذہبی عقیدوں کا سوال۔ ان عقیدوں میں سب سے اہم عقیدہ ایک خدا یعنی دنیا کے بنانے والے پر ایمان لانا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بودھ مذہب دنیا کے بڑے سے بڑے مذہبوں میں گِنا جاتا ہے۔ غالباً اپنے ماننے والوں کی تعداد کے لحاظ سے بودھ مذہب دنیا میں دوسرے نمبر کا مذہب ہے۔ لیکن بودھ مذہب اور جین مذہب دونوں میں سے کوئی بھی دُنیا کے بنانے والے کسی خدا کو نہیں مانتا اور نہ اس طرح کے کسی خدا کی پرستش کو ضروری سمجھتا ہے۔ تاہم یہ دونوں مذہب دنیا کے بڑے سے بڑے مذاہب میں گنے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مذہب کا اصل مطلب وہ راہ یا راستہ ہی ہے جس پر چل کر انسان بہبودی حاصل کر سکے۔ اسی نگاہ سے ہمیں اب کمیونزم کو بھی دیکھنا چاہیئے۔

کمیونزم کے اصولوں سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو ظاہر ہے کہ کمیونزم زندگی کی ایک راہ ہے، مل کر زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ ہے جسے آج اس دھرتی کے لگ بھگ نوّے کروڑ انسان سوچ سمجھ کر اختیار کر چکے ہیں۔ اس راستے کو اختیار کرنیوالوں کی تعداد بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے کچھ صاف اور جانے بوجھے اُصول ہیں۔ کمیونزم وہ راستہ ہے جس پر چل کر امیر اور غریب کا فرق اگر مٹتا نہیں تو کم از کم بہت کم ہو جاتا ہے۔ اونچ نیچ کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔ نسل اور رنگ کا امتیاز جاتا رہتا ہے۔ کروڑوں صدیوں سے دبے ہوئے انسانوں کی زندگی کا معیار اونچا ہو جاتا ہے اور انسانی سماج کو اس منزل مقصود کی طرف قدم بڑھانے لگتا ہے جہاں پہنچ کر الگ الگ ملکوں اور قوموں کے سب

انسان ایک مشترکہ خاندان کی طرح زندگی بسر کریں۔ یہ معیار کوئی چھوٹا یا معمولی معیار نہیں ہے۔ دُنیا کے سب بڑے بڑے مذاہب یہی معیار ہمارے سامنے رکھتے آئے ہیں۔ ہندو دھرم کا کہنا ہے کہ "دُنیا کے سب انسان ایک کنبہ ہیں"۔ قرآن میں لکھا ہے:۔ "اور تمام انسان ایک واحد قوم کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔" اسی طرح کی تعلیم ہمیں دنیا کے سب مذہبوں میں ملتی ہے۔ کمیونزم انسانی مساوات کا علم بردار ہے۔ اس کا ایک خاص اصول ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کی محنت سے بیجا فائدہ نہ اُٹھائے۔ سب اپنی محنت کا کھائیں اور دنیا کے سیاسی انتظام کی باگ ڈور محنت کش لوگوں کے ہی ہاتھوں میں رہے۔ کمیونزم عورتوں کو بھی مردوں کے برابر کا درجہ دیتا ہے۔ اخلاق پر اس کا خاص زور ہے۔ چین میں زندگی کے تین سب سے بڑے اصول "ایمانداری، سادگی اور خدمتِ خلق" مانے جاتے ہیں۔ روس میں وہاں کے نیتا خروشچیوف نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ:۔ "ہم کسی مذہب کو مانیں یا نہ مانیں ہم نے آج تک کسی کے ساتھ بھی اپنے عہد وپیمان کو نہیں توڑا اور نہ ہم کسی کو زبان دے کر اس سے پیچھے ہٹنا اپنے لئے روا سمجھتے ہیں۔" روس کے سب سے بڑے اخبار کا نام "پراودا" ہے۔ پراودا کے لفظی معنی "سچائی" ہیں۔ شمالی روس کی ہزاروں برس کی پرانی جنگلی قوم اسکیمو کو تعلیم و تربیت دے کر دنیا کی مہذب سے مہذب قوموں کے برابر لا کر کھڑا کر دینے کا سہرا کمیونسٹ روس ہی کے سر بندھ سکا۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ جنسی اخلاق یا جنسی نیک چلنی کے لحاظ سے بھی روس اور چین دونوں ملکوں کا درجہ اس وقت ہمارے جیسے ان بہت سے ملکوں سے

کہیں اُونچا ہے جو اپنے آپ کو کسی خاص اصلاحی مذہب کا ماننے والا بتاتے ہیں۔ روس اور چین دونوں اس وقت جنگ کے خلاف اور امنِ عالم کے سب سے زبردست علمبرداروں میں سے ہیں۔ پچھڑی ہوئی، دبی ہوئی اور غلام قوموں کے وہ سب سے زیادہ ہمدرد اور مددگار ہیں۔ کمیونزم اپنے قدم اس طرف کو بھی بڑھا رہا ہے جہاں پہنچکر پھر کسی طرح کی حکومت، یا سرکار کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ان سب نگاہوں سے اگر دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ اگر جین مت یا بودھ مت مذہب کہلا سکتے ہیں تو کمیونزم بھی ایک مذہب اور دُنیا کے بڑے سے بڑے مذہبوں میں سے ایک مانا جا سکتا ہے۔

اس پر ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ کمیونسٹ خود اپنے کو مذہبی یا کمیونزم کو مذہب نہیں مانتے۔ اس کی صریح وجہ مذہب کے وہ تنگ معنی ہیں جو کہ عام مذاہب کے ماننے والوں نے لفظِ مذہب کو پہنا رکھے ہیں۔ اس کی وجہ وہ غلط کاریاں اور بدعنوانیاں بھی ہیں جو دوسرے اصلاحی مذہبوں کے ماننے والوں نے مذہب کے نام پر روس اور چین جیسے ملکوں اور خاص کر وہاں کی عوامی تحریکوں کے خلاف کی ہیں۔

کمیونزم اور مذہب میں ایک اور بڑا فرق بتایا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کے تمام اصلاحی مذہب یہاں تک کہ جین مذہب اور بودھ مذہب بھی جو کسی خالق کے وجود کو نہیں مانتے۔ کسی نہ کسی طرح کی روحانی زندگی یا روحانیت کے قائل ہیں۔ وہ موت کے ساتھ انسان کی افرادی زندگی کا خاتمہ نہیں مانتے جبکہ کمیونزم موت کے بعد کی کسی زندگی کا قائل نہیں ہے اور نہ روحانیت یا روحانی زندگی جیسی

کسی چیز کو مانتا ہے۔ یہ اعتراض بہت گہرا اعتراض ہے اور ایک بڑے درجے تک سچا ہے حالانکہ "روحانیت" اور "روحانی زندگی" جیسے الفاظ آجکل کے کمیونسٹ مفکّروں کی تحریروں میں بھی اکثر پڑھنے کو ملتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ کمیونزم کی نگاہ سائنسی نگاہ ہے اور سائنس اور مذہب میں عام طور پر تضاد مانا جاتا رہا ہے۔ یہ تضاد ایک درجے تک سچ بھی ہے لیکن دنیا کے اور تضادوں کی طرح اب یہ بھی آہستہ آہستہ بلکہ کافی تیزی کے ساتھ کافور ہوتا جا رہا ہے۔ موجودہ کمیونزم کی پیدائش انیسویں صدی کی سائنس سے ہوئی تھی اور انیسویں صدی سے اب تک دنیا کی سائنس کافی منزلیں طے کر چکی ہے ہمیں یہ بھی یقین ہے اور اس کے آثار جگہ جگہ صاف دے رہے ہیں کہ کمیونزم دنیا کی اور زندہ طاقتوں کی طرح ایک بڑھتی اور بدلتی ہوئی چیز ہے۔

سائنس اور مذہب کا یہ بنیادی فرق بھی کہ سائنس بے جان میٹر یعنی مادّہ کو دُنیا کی اصلیت مانتی ہے اور مذہب روح کو، اب مٹتا جا رہا ہے۔ ہم یہاں اس صدی کے محض ایک دو بڑے بڑے سائنسدانوں کی رائے دیدینا چاہتے ہیں۔ انگلینڈ کے مشہور میتھمیٹشین اور ایسٹرانامر، گریٹ بریٹن کی رائل سوسائٹی کے سیکریٹری سر جیمس جینس نے لکھا ہے:۔

"The universe begins to look more like a great Thought than like a great Machine. The apparent objectivity of things is due to their subsisting in the mind.

we reach the concept of the universe as a world of pure thought. Mind no longer appears as an accidental intruder in the realm of Matter. We are beginning to suspect that we ought rather to hail it as the creator and the governor of the realm of Matter. The final direction of change will probably be away from the materialism which characterised 19th century physics. The old dualism of Mind and Matter seems likely to disappear through substantial Matter, resolving itself into a creation and manifestation of Mind." (The new background of Science 1933, and the Mysterious Universe, 1937.)

یعنی ——— "اب یہ دُنیا بجائے ایک بہت بڑی مشین کے ہمیں ایک بہت بڑا خیال معلوم ہونے لگی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چیزوں کی ظاہرا مادی صورتیں سب کسی بڑے دماغ کے اندر صرف خیال کی صورت میں موجود ہیں۔ اب ہمارا

اپنا تخیل دنیا کی بابت یہ ہوتا جا رہا ہے کہ یہ دنیا محض خیال کی دنیا ہے اب ہمیں (انسانی) ذہن ایک ایسی چیز معلوم نہیں ہوتا جو اس مادی دنیا میں کہیں سے اتفاقاً پیدا ہو گیا ہو۔ اب ہمیں یہ شک ہونے لگا ہے کہ انسانی ذہن کو ہی مادی دنیا کا بنانے والا اور چلانے والا ماننا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری رائے میں آخری تبدیلی یہ ہو گی کہ ہم انیسویں صدی کی سائنس کی میٹریلیزم سے ہی ہٹ جائینگے۔ ہم مادے اور خیال کو جو پہلے دو چیزیں سمجھا کرتے تھے، وہ سمجھ اب مٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب مادی چیزیں اب ہمیں ذہن ہی کی پیداوار اور اسی کا ظہور دکھائی دیں گی"۔

پروفیسر سر اے ایس ایڈنگٹن لکھتے ہیں:- "کوئی غیبی طاقت کچھ کر رہی ہے، ہمیں نہیں معلوم کیا کر رہی ہے۔ آجکل کی فزکس میں سے بے جان مادے کا خیال بالکل جاتا رہا۔ اب ہمارے تجربے میں سب سے پہلی اور سب سے صریح چیز "خیال" ہے۔ میں خیال ہی کو بنیادی چیز مانتا ہوں۔ اور مادے کو خیال کی پیداوار مانتا ہوں"۔

دی گریٹ ڈزائن نام کی کتاب میں جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ یورپ اور امریکہ کے چودہ بڑے بڑے سائنسدانوں نے جن کے نام دینے کی ضرورت نہیں ہے اپنی یہ متحدہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ دنیا ایک بنا روح کی مشین نہیں ہے۔ اور نہ محض اتفاق سے وجود میں آ گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"There is a Mind behind the veil of Matter, give it what name we will."

یعنی —— "مادے کے اس پردے کے پیچھے ایک دماغ کام کر رہا ہے"

اُسے چاہے ہم کچھ بھی نام کیوں نہ دیں۔"

دنیا کے سب سے بڑے سائنسداں البرٹ آئنسٹائن کا یہ فقرہ دنیا بھر میں مشہور ہے:۔

"I believe in God who reveals him-self in the orderly harmony of the Universe."

یعنی ——— "میں خدا پر اعتقاد رکھتا ہوں جو اس سارے عالم کی ترتیب اور تال میل میں اپنے کو ظاہر کر رہا ہے۔"

اسی طرح کی اور بہت سی رائیں نقل کی جا سکتی ہیں۔ انگلینڈ کے مشہور اسٹرانامر سر آرتھر ایس ایڈنگٹن نے لکھا ہے:۔

"The old atheism is gone. Religion belongs to the realm of spirit and mind, and can not be shaken."

یعنی ——— "خدا سے پرانا انکار اب جاتا رہا۔ مذہب کا تعلق روح اور خیال کی دنیا سے ہے اور اس سے ہم ہٹ نہیں سکتے۔"

غرضکہ سائنس اور مذہب کا پرانا تضاد اب مٹتا جا رہا ہے۔ سچی سائنس اور سچے سائنس دانوں کا دماغ ایک کھلی ہوئی چیز ہے۔ ہمیں انسانی قوم کے دماغوں پر بھروسہ ہونا چاہیئے۔ علم اگر ٹھیک راستے پر چلے گا تو وہ حقیقت تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سائنس کا تعصب کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح مذہب کو بھی اپنے پرانے ریت رواج اور توہمات کے جنجالوں سے باہر نکلنا نہ ہوگا۔ حق یہ

ہے کہ آئندہ کی دنیا میں وہی مذہب ٹھہر سکے گا جو سائنسی تحقیقات کی کسوٹی پر پورا اُتر سکے گا اور سائنس آج کل کی مادہ پرستی سے ہٹ کر روح اور روحانیت کی طرف بڑھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دُنیا کو ایک سائنسی مذہب اور مذہبی سائنس کی ضرورت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ دُنیا کے قدم استقلال کے ساتھ اُسی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ضرورت صرف ہر طرح کے تعصب سے اوپر اٹھنے اور اپنے دماغوں کو کھلا رکھنے کی ہے۔ اس کے لئے ہر انسان کو، ہر مذہب کے ماننے والوں کو اور ہر سائنسداں کو اپنے اعتقاد پر قائم رہنے، اپنی راہ پر چلنے، اپنے طریقے سے آگے بڑھنے اور دُنیا کی خدمت کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کمیونسٹ ملکوں خاص کر روس اور چین میں آج ہر شخص کو اس چیز کی پوری آزادی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس طرح کی آزادی کسی ایک مذہب کو ماننے والی حکومت میں یا کسی ایک مذہب کو دوسرے مذاہب پر فوقیت دینے والی حکومت میں نہیں ہو سکتی۔ ہم یہاں پر مثالیں دینا نہیں چاہتے۔ دنیا کی آئندہ کی ساری ترقی کا دارمدار اسی بات پر ہے کہ دُنیا کی سرکاریں ہر قسم کی مذہبی اور اعتقادی طرفداری سے بالاتر ہوں اور ہر ملک کی سرکار ہر طرح کی آزاد خیالی کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا پورا موقع دے۔ چینی لیڈر ماؤ تسے تنگ کے حال کے ان فقروں میں کہ سب قسم کے خیالات ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوشش کریں اور سیکڑوں طرح کے پھول ہمارے اس باغ ہستی میں کھل کر ہمارے دلوں اور دماغوں کو معطّر کریں، ہمیں اسی حقیقت کی جھلک ملتی ہے۔ اس لحاظ سے میں چاہتا ہوں کہ دُنیا کے مذہبی لوگ ہمدردی کے ساتھ کمیونزم کو سمجھنے کی اور کمیونسٹ لوگ مذہب کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

اسی نگاہ سے میں نے اس چھوٹی سی کتاب "کمیونسٹ اور مذہب" کے مسوّدے کو غور سے پڑھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف ظ۔ انصاری صاحب کمیونزم کے نظریئے سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ تقریباً دو سال سوویت یونین میں رہ چکے ہیں۔ عربی کی بھی انھوں نے بہت اچھی تعلیم پائی ہے۔ اسلام کے ارکین اور اصولوں سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور برسوں "مولویانہ زندگی" بھی بسر کر چکے ہیں۔ جہاں تک ان کی تصنیف سے معلوم ہو سکتا ہے اور مجھے ان سے گفتگو کرنے کے بھی مواقع ملے ہیں، انسانی اور ادبی دونوں لحاظ سے نہایت شریف، ایماندار اور انصاف پسند آدمی ہیں۔ ان کی اس کتاب کے آخری باب کمیونسٹوں اور مذہب کے باہمی تعلق کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے میں بہت بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو کسی بھی مذہب پر اعتقاد رکھتا ہے اور اس کے رشتے سے کیمونزم کو سمجھنا چاہتا ہے اس کتاب کو ضرور پڑھے۔ عام طور پر بھی یہ کتاب مذہبی لوگوں اور کیمونسٹوں دونوں میں محبت اور راست فہمی بڑھانے کا ایک ذریعہ ہو سکتی ہے اور دونوں کے لئے مفید ہے۔

نئی دہلی — سُندر لال

۲۶ جنوری ۱۹۵۸ء

پیش گفت

سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہنے والے لاکھوں آدمیوں کی طرح میں بھی زندگی کی پیچ در پیچ ڈگر کے چکر کاٹ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج علم و خبر کی کنجی مارکسزم ہے۔ آدمی کی سماجی تاریخ ہو یا اس میں علوم و فنون، مذہب اور اخلاقیات کے الگ الگ ڈھانچے، ان کا اندرونی رشتہ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے، ذہن کو فضول کے اعتقادوں اور تعصبوں سے پاک رکھ کر سفید و سیاہ کو پرکھنے کے لئے اور صدیوں کے فکری اور مادی دفینوں کے تالے کھولنے کے لئے ہمارے زمانے میں ذہن انسانی کو یہ ایک کنجی ہاتھ لگی ہے۔ مارکس ازم اس سے قفل کھل جاتے ہیں اور آگے بڑھنے کی راہ مل جاتی ہے اب آگے قدم دھرنا، اشیاء کی چھان بین کرنا اور ان کے کیف و کم کا پتہ لگانا ہر ایک کی اپنی صلاحیت، محنت اور اپنی اپنی بساط پر منحصر ہے۔ مارکسزم کی روشنی میں لوگ ابھی تک اس منزل تک پہنچے ہیں کہ اپنے اسلاف اور اپنے اطراف کی تہہ در تہہ زندگی کا اتہ پتہ دے سکیں۔ آخری حکم لگانا اور قطعی فیصلہ دے کر

اُٹھنا کسی ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

وہ جس نے سو برس پہلے مارکسزم کو 'روحِ عصر' کہہ کر پکارا تھا، برحق تھا۔ عصرِ حاضر کے تن بدن میں یہ روح سمائی ہوئی ہے۔ کہیں شرار بن کر، کہیں لہو بن کر۔ 'روحانیت' کے وہ مُصدِق اور مُجدِد جو اس کے روحِ عصر ہونے سے انکار کرتے ہیں، ان کو بھی مارکسزم سے مفر نہیں۔ وہ بھی اسے رد کرنے کے لئے اصطلاح اور استدلال یہیں سے لیتے ہیں۔

روحانیوں کی بھیڑ کے درمیان، ہر زمانے میں، ایسے حق پرست لوگ بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں جو ہر ایک علم، عزم اور ایجاد کو شک یا نفرت سے نہیں بلکہ اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ آیا اس کا رُخ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو خود ان کے اپنے نقطۂ نظر سے بہتری کی طرف لے جانے والا ہے یا ابتری کی طرف۔ پرکھ میں ان کا اپنا نقطۂ نظر چاہے کچھ ہو، لیکن اس کی تہہ میں کہیں نہ کہیں جو شئے پوشیدہ ہوتی ہے وہ ہے انسان اور انسانیت کی دردمندی۔ یہ لفظِ انسانیت کتنا ہی مبہم سہی، مگر اس کی دردمندی سے میری مراد وہی ہے جسے اہلِ مذہب دینداری کہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ انسان اور انسانیت کی دردمندی سے جو بصارت اور بصیرت آدمی کو ملتی ہے وہ کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی، دو طرفہ ہوتی ہے۔ نئے اور پرانے، اجتہاد اور اعتقاد، سائنس اور مذہب کی کش مکش میں وہ ایک فریق سے آنکھیں موند کر دوسرے فریق کو گلے نہیں لگاتے، بلکہ دونوں سے رشتہ رکھ کر اپنی راہ بوجھتے ہیں۔ دو انتہاؤں پر پہنچی ہوئی اس فضا میں پنڈت سندر لال

کا دم غنیمت ہے جو روحانیوں میں پلے بڑھے اور مادیوں سے خدا واسطے کا بیر نہیں رکھا۔ جنھوں نے مذہب کو برتا اور کمیونزم کو اس کے عمل سے پرکھا۔ جو اشتراکی سماج کے اخلاقی نظریے اور عمل سے بے وجہ کی بدگمانیاں نہیں رکھتے۔ اور اہلِ مذہب کے قول و عمل کو گہرائیوں تک جانتے ہیں۔

گاندھی جی کے رفیق، ہندوستان میں مشترکہ اور روشن خیال تہذیب کے علمبردار، اور رچی بسی ہندوستانی تہذیب کے رسیا پنڈت سندر لال میری نظر میں سب سے موزوں شخصیت ہیں جو کمیونزم اور مذہب کے متعلق ان تعارفی مضامین کو حق کے دھرم کانٹے میں تول سکتے ہیں۔ اور مجھے خوشی ہوئی کہ برسوں کے گم شدہ مسودے نے بالآخر یہ شرف حاصل کیا۔ نہایت ادب کے ساتھ میں پنڈت جی کے فکری اسٹینڈ سے اختلاف کر سکتا ہوں لیکن ان کی سلامت روی اور راست بازی سے انکار کرنے کی جرأت شاید ان کے دشمنوں کو بھی نہ ہو۔

چھ باب کی یہ کتاب "کمیونسٹ اور مذہب" دراصل الگ الگ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مگر مضمون لکھتے وقت انھیں کتابی صورت دینا مقصود تھا۔ اس لئے ایک مضمون کا دوسرے سے ظاہری اور باطنی سمبندھ بھی ہے۔

لکھتے وقت میرے ذہن میں تین قسم کے پڑھنے والے رہے ہیں۔ ایک وہ عام لوگ، جنھیں کمیونزم کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکایا جاتا ہے کہ کمیونسٹ اگر برسرِ اقتدار آگئے تو تمھارے مندر مسجد ڈھا دیں گے اور تمھارے پیارے مذہب کو ملیا میٹ کر دیں گے وہ اس مکروہ پروپگنڈے کا شکار ہو جاتے ہیں اور چونکہ کمیونسٹوں سے ایک تعصب اُن کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے اس لئے وہ دُور دُور رہتے ہیں۔ انھیں یہ موقع

نہیں ملتا کہ سیدھی سچی بات ان تک پہنچ سکے۔

ایسے لوگوں کے لئے کتاب کا چوتھا، پانچواں اور چھٹا باب خاص ہے — "ٹکراؤ ہے یا نہیں"۔ "مذہب کی آزادی" اور "آنکھوں دیکھی"۔ میں انھیں اپنے کمزور تعصب کا رد اور اپنے سوال کا جواب مل جائے گا اور میرا خیال ہے اگر وہ اس کتاب کی ہر بات کو پہلے سے جھوٹ فرض کر کے چشم و گوش پر مہریں نہیں لگا چکے ہیں تو ان کا اطمینان بھی ہو جائے گا۔

دوسرے پڑھنے والے وہ تحقیقی لوگ ہیں جو سوال کو علمی اور فکری بنا کر سامنے رکھتے ہیں اور فلسفے یا نظریے کی زبان میں سننا اور پرکھنا چاہتے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ عملی طور پر تو آپ مذہبی لوگوں کو تھوڑی بہت چھوٹ دے دیتے ہوں، یا مخالفوں کی زبان بند کرنے کے لئے مذہب کو برداشت کر لیتے ہوں۔ لیکن دراصل اندر سے آپ کا مشن مذہب کے درپے آزار ہوا ور اسے آپ بزور طاقت مٹا دینے پر تلے ہوئے ہوں۔

اس طرح کے لوگ اگر صرف بحثیئے نہ ہوں اور جانچنے پرکھنے کا سچا جذبہ رکھتے ہوں تو ان کے سوالوں کا جواب پہلے اور تیسرے باب میں خصوصیت سے موجود ہے۔

تیسری قسم ان پڑھنے والوں کی ہے جو کمیونسٹوں سے، ان کے روزانہ کے پروگرام سے اور انسانیت کے لئے ایک خوشگوار مستقبل سے ہمدردی تو رکھتے ہیں لیکن صدق نیت سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کمیونسٹ فلسفہ مذہبوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور کیوں دیکھتا ہے۔ عملی طور سے انھیں وشواس ہے کہ کمیونزم ان کے مذہب کو مٹانے کا کوئی اندولن نہیں ہے اور نہ اس کی براہ راست جنگ کسی مذہب یا

مذہبی گروہ سے ہوتی ہے۔ لیکن وہ اپنی معلومات کو بھی اس سلسلے میں کچھ بڑھانا چاہتے ہیں اور تفصیل جاننے کا شوق رکھتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے پڑھنے کا مسالہ دوسرے باب میں ملے گا۔ مصلحت کا تقاضہ تھا کہ اس باب کو اتنا بے نقاب نہ ہونا چاہیے جتنا وہ ہے کیونکہ کمیونزم اور کمیونسٹو (دل) کے دشمن اسے توڑ موڑ سکتے ہیں۔ لوگوں کی وہم پرستی اور تعصب سے ناجائز فائدہ بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ اور یہ کتاب فائدے کی بجائے ممکن ہے کسی کسی کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جائے۔

لیکن مصلحت کے اس تقاضے کو رد کرتے ہوئے میری کوشش یہ ہے کہ اصل سوال کو گول مول نہیں، بلکہ پوست کندہ اور صاف صاف پیش کر دیا جائے تاکہ وہ کم از کم اس حلقے کے لئے مفید ہو سکے جو اپنے ذہن کے جالے صاف کرنے کی قوت رکھتا ہے اور بالکل ہی بے شعور یا بے ایمان نہیں ہے۔

دوسرے باب کے شامل کرنے کا مقصد یہی ہے، لیکن یہ مقصد پورا اس وقت ہوتا کہ مذاہب کی سماجی تاریخ ذرا اور تفصیل سے لکھی جاتی اور کھل کر بحث کی جاتی۔ اس کے لئے زیادہ ورق، زیادہ مطالعے اور کہیں زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ آخرالذکر دو باتیں فی الحال میرے بس سے باہر ہیں۔ جو لوگ تفصیلی مطالعہ چاہتے ہوں انھیں اینگلز کی "اینٹی ڈوہرنگ"، "لڈوگ فیور باخ"، مارکس کے منتخبات جلد اول، لینن کے مضامین کے علاوہ جدلیاتی اور تاریخی مادیت کے فلسفے پر تازہ لٹریچر کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے۔ مسالہ بہت ہے مگر بکھرا ہوا ہے اور اسے یکجا کرنا مشکل۔ یہاں صرف اشاروں کی سی حیثیت ہے تاکہ موضوع پر تھوڑی بہت روشنی پڑ جائے۔

چوتھا باب تمام اوراق کا نچوڑ اور ان کا مقصد ہے۔ اسی لئے وہاں بعض مذکورہ جملوں کی تکرار بھی ہوئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ باب عام پڑھنے والوں سے لے کر پڑھے لکھے لوگوں تک، سب کے لئے سوچنے سمجھنے اور اتفاق کرنے کا ضروری سامان فراہم کرے گا۔

اس کتاب کے حوالوں میں جہاں جہاں بریکٹ یا توسین (—) نظر آتے ہیں، وہ تشریح یا وضاحت کی خاطر خود میں نے بڑھائے ہیں۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ اردو کا لب ولہجہ ابھی ان مسائل کو اصطلاحی جملوں میں بیان کرنے کا عادی نہیں ہے۔

یہ کتاب اس سلسلے کی اردو میں پہلی کڑی ہے اور اس اعتبار سے بالکل ابتدائی بھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد بہتر تصنیفیں اس موضوع پر آئیں گی اور سوال کو زیادہ تشریح، زیادہ باریک نظری سے حل کریں گی۔

اس کتاب کے پہلے پانچ باب جون ۱۹۵۲ء میں لکھ کر پبلشر کے حوالے کئے جا چکے تھے، لیکن نظرِ ثانی کی فرصت نہ ملی اور مسودہ شائع ہونے سے رہ گیا۔ یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ ۱۹۵۵ء کے آخر میں حکومتِ ہند کی طرف سے ماسکو میں اردو، ہندی اور بنگالی زبانوں میں ادبی کام کرنے کے سلسلے میں جو چار آدمیوں کا انتخاب ہوا اس میں میرا نام بھی تھا۔ اور میں مئی ۱۹۵۶ء میں یہاں چلا آیا۔ یہاں رہ کر، دیکھ بھال کر کئی بار میری خواہش ہوئی کہ "کمیونسٹ اور مذہب" کے موضوع پر تفصیل سے ایک کتاب لکھی جائے۔ کیونکہ اب تو محض کتابوں سے اور اقوال سے نتیجہ نکالنے کا سوال نہیں رہا۔ جو ہے وہ عین الیقین ہے۔

آنکھوں کے آگے ہے۔ پرکھ لو اور اطمینان کر لو۔

اس موضوع پر لکھنے کی پیاس بشرطِ فرصت باقی ہے۔ البتہ اس کا ماحصل آخری چھٹے باب کی صورت میں یہاں بڑھا دیا گیا ہے۔ اگر یہ کتاب پڑھنے والوں کے پسند خاطر ہوئی تو اگلی بار موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی تمنّا رکھتا ہوں۔

صاحبِ نظر پڑھنے والے واقعی رہ نما ہیں مصنّف کے لئے۔ امید ہے کہ وہ اس بار بھی میری محنت کا صلہ دیں گے۔ اور براہِ راست ذیل کے پتے پر اپنی رائے اور تنقید سے آگاہ کریں گے۔

۲۱۔ زوُبووسکی بلوُر — ظ۔ انصاری

ماسکو — ۶ ستمبر ۱۹۵۷ء

اصل سوال

کمیونزم کا نظریہ ایک سائنس ہے، سماج کی سائنس۔ انسانی تاریخ کے پچھلے تجربوں کو سامنے رکھ کر سماج کو آگے لے جانے والی اور اسے بے طبقہ سوسائٹی کی طرف بڑھانے والی سائنس۔ یہ ایسے اعتقادات کا نام نہیں ہے جو اوپر سے آئے ہوں۔ نہ وہ ایسے احکام پیش کرتی ہے جو فطرت یا سماج کی طاقتوں کے سامنے آدمی کی بےبسی یا جبر کو ظاہر کرتے ہوں۔ یہ انسانی قوتوں کے اختیار کا فلسفہ ہے۔ آدمی ہزاروں سال سے فطرت اور سماج دونوں کی بے محابا طاقتوں کے مقابلے میں اپنے حالات اور اپنی سوچ سمجھ کے مطابق جد وجہد کرتا رہا ہے اور انسانی طاقتوں کو پھیلانے کے لئے دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا ہے۔ آگے بڑھتے بڑھتے ایک منزل وہ آئی کہ مارکسزم کا نظریہ نمودار ہوا۔ یہ نظریہ خود سماجی حالات، سماجی شعور اور سائنسی ترقی کا پیدا کیا ہوا ہے۔

یہ نظریہ سامنے آیا تو محنت کشوں کا ایک ہتھیار بن گیا۔ وہ اس کی وجہ سے زیادہ منظّم اور طاقت ور ہوتے گئے یہاں تک کہ لینن نے مزدور طبقے اور

محنت کشوں کو ساتھ لے کر اس نظریے کو عملی شکل میں ڈھال دیا۔ لینن نے مارکس اور اینگلز کے نظریے اور ان کی تحقیقات کو اور آگے بڑھایا۔ تجربے نے ثابت کیا کہ مارکس ازم اور لینن ازم خالی خولی فلسفہ نہیں ہے بلکہ مارکس کے لفظوں میں:۔

"(اب تک کے) فلسفیوں نے دنیا کی تفسیر کی ہے۔ لیکن اصل سوال دُنیا کو بدلنے کا ہے"

اس نے سماج کو موجودہ مصیبتوں سے نکلنے اور بدل ڈالنے کی راہ دکھائی اور اس کی تدبیریں بتائیں، داؤ پیچ سکھائے۔ اور دُنیا میں پہلی بار ایک ملک میں یہ تجربہ کامیاب رہا۔ دوسروں کی محنت پر جینے والے جتنے طبقے تھے اُن کے اقتدار کا تختہ ہمیشہ کے لئے اُلٹ دیا گیا۔ صنعتی اور تنظیم یافتہ مزدور طبقے (پرولتاری) نے دوسرے تمام محنت کشوں کو ساتھ لیا۔ سرمایہ دار (بورژوا) طبقے کی حکومت ختم کی اور اپنا اقتدار قائم کر دیا تاکہ اس اقتدار کے عرصے میں طبقاتی لوٹ کھسوٹ کے جتنے باقیات رہ گئے ہیں، اُنھیں مٹا دیا جائے۔ یہاں پر مختصر الفاظ میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ سماج کے مادی پہلو پر روشنی ڈالنا ضروری ہے مثلاً پیداواری مسائل کے بارے میں۔ اور سرمایہ داروں کے اندرونی یا بیرونی حملوں سے ملک کو محفوظ رکھا جائے۔ اور ہر طرف سے محفوظ کر کے ایک ایسے بے طبقہ سماج کی عمارت کھڑی کی جائے جس میں فرد اور جماعت طبقاتی دباؤ سے آزاد ہو۔ ہر شخص کا دُکھ پورے سماج کا دُکھ ہو اور اس کا سکھ پورے سماج کا سکھ ہو۔ انسانیت کے جتنے لوازم ہیں اور جتنے تقاضے ہیں اُن پر کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہو۔ اور فرد اور سماج ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ ہر شخص اپنی صلاحیت

کے مطابق کام کرے اور اپنی ضرورت کے مطابق پائے۔

یہ ہے کمیونسٹ سماج کا تصور جس کی فضا میں اب سوویت روس داخل ہو چکا ہے اور سو برس پہلے کا مارکسی تصور، نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال کر نیا آزاد اور خوش حال سماج، ذہنی، جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے تر و تازہ اور متحد سماج تعمیر کر رہا ہے۔ جس کی ناقابلِ شکست قوتوں کے سامنے دنیا کی سب سے بڑی جنگی قوت گھٹنے ٹیک چکی ہے جس سے انسانی محبت، خلوص، اخوت، آزادی اور برادرانہ امن کے تمام دشمن بوکھلائے ہوئے ہیں! اور نفرت، الزام تراشی، تہمت فرقہ پرستی، تفرقہ اندازی، دھوکے، فریب، دھمکی اور جنگی تیاری کے تمام حیلے اختیار کر لیے ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے خود اپنی منافع خوری کی خاطر انسان سے وہ تمام پاکیزگیاں اور خوبیاں چھین لیں جو مذہب نے اپنی تعلیم میں رکھی تھیں۔ وہی آج مذہب کے سب سے بڑے رکھوالے بنے ہیں اور دنیا کو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ کمیونزم کی تحریک مذہب اور اخلاق کو بزورِ طاقت مٹا ڈالنا چاہتی ہے اور سماج کو بے ضابطہ کر دینا چاہتی ہے۔ ہم اس جھوٹ کو جھوٹ کہہ کر فکرمند اور سادہ دِل لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جب تک کھلے لفظوں میں انھیں یہ نہ بتائیں کہ:-

۱۔ کمیونسٹ فلسفہ کیا ہے، سماج کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر کیا ہے اور تاریخِ انسانی کو وہ کس نظر سے دیکھتا ہے۔

۲۔ پھر یہ کہ تاریخ میں مذہب کا کیا مقام ہے اور مزدور طبقے کے اقتدار میں مذہب سے کیا برتاؤ کیا جائے گا اور آج کیا کیا جا رہا ہے۔

پہلے سوال کا جواب دینے میں دفتر کے دفتر موجود ہیں اور انھیں کسی صورت

میں بھی چند صفحات کے اندر جامع اور مانع طریقے سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مارکسزم نے جدلیاتی اور تاریخی مادیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے اسے مختصر سے مختصر لفظوں میں اگر لکھا جا سکتا ہے تو اس کا ان سے واسطہ ہے جنہوں نے لکھا ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہاں اصل موضوع کی خاطر ایک وضاحت ضروری ہے۔

جب ہم مارکس ازم کی اصطلاح مادیت یا مادیت پرستی یا مادیت پسندی استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ دنیا کی ہر شئے، ہر واقعہ، ہر تحریک اور ہر جذبے کو ہم صرف مادی خواہشات یا کھرے طریقے سے مادی حرکات سمجھتے ہیں اور نہ اس کا مطلب ہے کھاؤ، پیو، عیش اڑاؤ اور محض اپنی اپنی نفسانی خواہشات کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ جاؤ بلکہ مارکسزم نام ہے جدلیاتی مادیت کی بنیاد پر کھڑے ہوئے نظریے کی پوری عمارت کا۔ اور جدلیاتی مادیت ایک باضابطہ فلسفہ اور دریافت ہے۔ یہ وہ فلسفہ نہیں جس کا تعلق خیال پرستی اور خیالی گھوڑے دوڑانے سے ہو۔ یہ قدیم اشراقیوں کا فلسفہ نہیں ہے جس کے نظریے محض اشراق، پرواز فکر اور دھیان کے ذریعے حاصل کئے جاتے تھے۔ اگر فلسفہ کی قدیم اصطلاحوں میں بات کہی جائے تو جدلیات ایک ایسا فلسفیانہ طریق کار ہے جس کا سلسلۂ نسب سقراط تک پہنچتا ہے اور مادیت وہ فکری بنیاد ہے جسے افلاطونی انداز فکر سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

جدلیات، دراصل فلسفیانہ مسائل کو منطق کی رو سے ناپنے اور جانچنے کا

عمل ہے۔ یہ عمل اپنی ابتدائی شکل میں یونان کے ان فلسفیوں کے ہاں ملتا ہے جو کسی چیز کا ثبوت یا اثبات حاصل کرنے کے لئے نفی اور تضاد سے بحث کرتے تھے۔ یہ عمل قدیم ہندستان میں اس وقت کیا جاتا تھا جب" سانکھیا سسٹم" پیش کیا گیا۔ یہ عمل عرب میں اس وقت ہوا جب الکندی، ابونصر فارابی اور بوعلی سینا نے افلاطونی اور آریائی فلسفوں کو ایک جگہ جمع کرکے ان سے نتائج نکالے۔ آج سے دو ہزار سال پہلے تک فلسفیانہ بحثوں میں جدلیاتی طریقے کے ابتدائی آثار پائے جاتے ہیں۔ اور کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز تک مختلف زمانوں کے فلسفوں میں اس کے آثار بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اس وقت سماجی حالات اور سماجی علم و شعور ایسی سطح پر تھا کہ اس زمانے کا جدلیاتی عمل اتنا سائنٹفک نہیں ہوسکتا تھا جتنا انیسویں (19) صدی میں ممکن ہوا۔ جب فطرت کی قوتوں کی دریافت اور اُن کا عمل ہزاروں برس کا سفر طے کر چکا۔ مارکس کا بیان ہے کہ اس نے جدلیاتی طریقہ ہیگل سے لیا۔ فرق یہ ہے کہ ہیگل کے یہاں یہ فلسفہ سر نیچے، پاؤں اوپر کئے کھڑا تھا۔ مارکس نے اس کے پیر زمین پر رکھ دیئے اور سر خود ٹھیک ہوگیا۔ ہیگل کا فلسفیانہ طریقہ اور نظامِ کائنات اور سماجی تاریخ کو معلوم کرنے کا طریقہ جدلیاتی تھا لیکن اس کا رجحان " آئڈیلزم" یا خیال پرستی (عینیت) کی جانب تھا۔ مارکس نے اس کی سمت اور اس کا سسٹم درست کر دیا اور اس کے طریق کار کو اپنا لیا۔

جدلیاتی مادیت کے فلسفے کی بنیاد تحقیق مشاہدہ اور تجربہ ہے اور تحقیق و تجربہ کو تین نئی دریافتوں نے ضروری آلات مہیا کئے ہیں۔

۱۔ سیل (cell) کی دریافت۔ جس سے پتہ چلا کہ سیل وہ یونٹ اور سب سے

چھوٹا جزو ہے جس کی ضرب اور تفریق سے تمام نباتات اور حیوانات کے اجسام میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور اس سے صرف اجسام میں نمودار ہونے والے تغیّرات ہی ایک اصول کے ماتحت نہیں رہتے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ خود سیل بھی ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ یہ وہ امکان ہے جس سے پتہ چلا کہ مختلف جسموں کی شکلیں کیسے بنی گئیں اور ان میں عام طور سے کیا تبدیلیاں آئیں اور آسکتی ہیں۔

۲۔ قوت کا ڈھل جانا۔ جس سے یہ پتہ چلا کہ جو قوتیں غیر جسمانی شکل میں پائی جاتی ہیں مثلاً بجلی، مقناطیسی قوت، حرارت اور کیمیاوی قوتیں وہ پوری کائنات کے حرکت میں رہنے کو مختلف شکلوں میں ظاہر کرتی ہیں ورنہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ایک خاص تناسب کے ساتھ جب یہ مختلف صورتیں ایک دوسرے کے اندر سے گزرتی ہیں تو ایک چیز جو غائب ہو جاتی ہے اس کی مقررہ مقدار کی جگہ دوسری چیز کی مقررہ مقدار وہاں آجاتی ہے اور اس طرح سے پوری کائنات کی حرکت کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کے قالب میں ڈھلتی رہتی ہے اور اس طرح سے زندگی رواں دواں رہتی ہے۔

۳۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقا جس نے بتایا کہ فطرت کے بنائے ہوئے جتنے اجسام آج ہماری دنیا میں نظر آتے ہیں وہ ایک دم آپ سے آپ ایسے ہی وجود میں نہیں آئے تھے بلکہ یہ ارتقا کا نتیجہ ہیں اور دھیرے دھیرے ایک طویل عرصے سے اجزاوی تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے جس سے اجسام کی یہ صورتیں اور موجودہ شکلیں بن گئی ہیں۔

اینگلز نے ان دریافتوں کی بنیادی اہمیت کو مانتے ہوئے ایک موقع

پر لکھا ہے کہ:-

"ان تین عظیم دریافتوں کی بدولت اور ان کے علاوہ علومِ فطرت ـــــ (Natural Science) میں جو دوسری زبردست ترقیاں ہوئیں ان کی بدولت ہم اس قابل ہوئے کہ اب بتا سکتے ہیں کہ نیچر (فطرت) کے مختلف عمل جو ہو رہے ہیں ان میں ایک کا دوسرے سے کہاں جوڑ ہے اور ایک دوسرے سے کس طرح وابستہ ہیں۔ ایسا الگ الگ دائروں میں ہی نہیں ہوتا بلکہ تمام دائرے مجموعی طور پر ایک دوسرے سے اسی طرح وابستہ ہیں۔ ایک کے عمل کو دوسرے کے عمل سے لازمی وابستگی ہے اب ہم قریب قریب ترتیب اور سسٹم کے ساتھ ایک پوری تصویر دکھا سکتے ہیں کہ کیسے فطرت کے اندر ایک عمل، ایک حرکت دوسرے سے بالکل وابستہ اور لازم و ملزوم ہے۔" [۱]

علومِ فطرت میں جو نئے تجربے ثبوت کی حد کو پہنچے ان سے مارکس نے اپنے فلسفے کیلئے مواد اخذ کیا۔ اور تحقیق یہاں تک پہنچی کہ یہ دنیا جیسی آج ہے، ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ جو اشیاء، اجسام اور پیکر آج نظر آتے ہیں وہ بالکل ویسے ہی نہ تھے بلکہ یہ ایک سلسلہ تغیر و تبدل ہے۔ ایک شئے دوسری پر اپنا عمل کرتی رہتی ہے اور دوسری شئے تیسری پر عمل جاری رکھتی ہے۔ تیسری شئے پہلی اور دوسری پر۔

---

[۱] اردو میں ابتدائی مگر تفصیلی مطالعے کے لئے دیکھئے "مارکسزم کیا ہے؟ (ایمیل برنس) "انسان کا عروج" (ایم وائی ہینگل) "سماج کا ارتقا" (کلیم اللہ) "روسی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ"

اور اس طرح باہمی سلسلۂ عمل، تاثیر اور تاثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو چیزیں آج مکمل صورت میں نظر آتی ہیں ان میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ تبدیلی ہے جو وجود اور عدم کی حد تک لے جاتی ہے۔ کچھ چیزیں بدلتے بدلتے غائب ہو جاتی ہیں اور کچھ نئی چیزیں ان سے اُبھر آتی ہیں۔ اگرچہ اس مسلسل عمل، ٹکراؤ اور تشکیل میں، رکاوٹیں بھی پڑتی ہیں، حوادث بھی آتے ہیں لیکن بالآخر ان میں "ارتقا" ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً دماغ ہی کو لیجیے۔ دماغ کیا ہے؟ مادّے کے مسلسل ارتقا کی سب سے اونچی شکل۔ وہ ایک مُجلّا آئینہ ہے جس پر بیرونی واقعات و حالات وغیرہ کی پرچھائیں پڑتی رہتی ہے۔ یہ پرچھائیں ہے جسے ہم احساس یا تصورات یا جذبات یا تحریکات کہتے ہیں۔ اور ان سے انفرادی یا اجتماعی عمل کا گہرا رشتہ ہے۔

یہ ہے ارتقائے فطرت۔ اس انداز سے فطرت کی بنائی ہوئی چیزوں میں ایک اندرونی عمل جاری رہتا ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر مارکسزم نے انسانی سماج کے اندرونی عمل اور عمل درعمل کے ساتھ اس کی ترقی کا راز دریافت کیا ہے اور بتایا ہے کہ فطرت کے اس عمل درعمل اور انسانی سماج کے ایسے ہی عمل درعمل میں گرچہ بنیادی اصول ایک ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک اہم فرق بھی نظر آتا ہے۔ فطرت کی کائنات میں (اگر آدمی کی دخل اندازی کو الگ کر دیا جائے تو) اندھی، بے شعور اور بے ارادہ قوتیں اور اشیا رہیں جو ایک دوسرے پر عمل کرتی رہتی ہیں، جیسے کنکری پھینکنے کے بعد پانی میں لہریں جو ایک دوسری کو بناتی بگاڑتی، غائب ہوتی اُبھرتی اور دھکا دیتی چلی جاتی ہیں اور ان کی ان تمام حرکات سے پانی میں کنکری گر جانے کے اس عمل اور عمل درعمل کا ایک عام اصول بن جاتا ہے لیکن سوسائٹی

یا سماج کے سمندر کا معاملہ دوسرا ہے۔ سماج کے اندر جو عمل کرنے والی قوتیں یا محرکات ہوتے ہیں انھیں فطرت نے دماغ اور شعور اور سوچ بچار کی قوت بھی عطا کی ہوتی ہے۔ وہ جذبات و احساسات کی قوت سے یا عقل و شعور کی قوت سے، سوچ کر، راستہ پہچان کر ایک خاص نتیجہ حاصل کرنے کے لئے بڑھتے ہیں۔ سماج میں جو یہ عمل در عمل کا سلسلہ رہتا ہے اور اس میں اجزار کا تصادم "جذب باہم" نئی شکلوں کا اُبھرنا، اُبھری ہوئی شکلوں کا مٹ جانا جاری رہتا ہے وہ انسانی دماغ کا سوچا سمجھا ہوا ہوتا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ کوئی تمام دماغ اور تمام سماج ہمیشہ بالکل ایک ہی طریقے سے تو سوچتے نہیں۔ ان میں بھی ایک کی سوچ دوسرے کی سوچ سے، اور کچھ لوگوں کا منشا دوسرے لوگوں کے منشا سے ٹکراتا رہتا ہے۔ بعض کے منشا غلط اور ناقص ہوتے ہیں۔ بعض کے پورا ہونے اور دوسروں کی منشا پر فتح پانے کا مناسب سروسامان نہیں ہوتا۔ بعض اس کے ذرائع غلط سوچتے ہیں۔ اور بعض منشا ایسے ہوتے ہیں کہ راستے تو صحیح مقرر کرتے ہیں لیکن ان کے مخالف منشا درمیان میں کود کر ان کی راہ روک لیتے ہیں۔

اور پھر ارادوں، خواہشوں، منشاؤں اور تدبیروں کے اس سمندر میں یہ عمل در عمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اسی سے بعض منشا پورے ہو جاتے ہیں بعض کے حلیے بدل جاتے ہیں۔ بعض کی ماہئیتیں بدل جاتی ہیں۔ بعض کے خواص بدل جاتے ہیں اور اس طرح ہزاروں لاکھوں تدبیروں اور کوششوں کی ان چو طرفہ لہروں کے ٹکراؤ سے اُبھرنے والے چند ارادے اور چند تدبیریں ہوتی ہیں جو ویسے ہی کامیاب ہوتی ہیں جیسے وہ سوچی گئی تھیں۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

لیکن اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ "قطرے کا گہر" بن جانا صرف اتفاقی بات ہے اور اس پر کسی کا قابو نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قابو بھی ہوتا ہے اور ارادہ، تدبیر، عمل اور پلان کا اثر بھی۔ لیکن سماج کے بحرِ ذخار میں اندرونی طاقتوں اور ان طاقتوں کے عمل در عمل کا اصول بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے جو ایک دوسرے سے اس طرح الجھا ہوا ہوتا ہے جیسے ریشم کے باریک تاروں کی گچھی۔ اور ان گچھیوں میں سے ایک ایک تار کا سلجھا کر نکال لینا بہت دشوار طلب ہوتا ہے۔

لوگوں کے سوچے ہوئے عمل، سلسلۂ عمل اور عمل در عمل سے مل کر انسانی سماج کی تاریخ بنی ہے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ سماج کی ظاہر شکلوں میں، جو مختلف زمانوں میں نظر آتی ہیں، کون کون سی قوتیں، کون کون سے ارادے اندر رہی اندر اپنا کام کرتے رہے ہیں۔ صرف کسی ایک شخص کی فطرت، اس کی شخصیت یا اس کے ارادے اور اس کے جذبات پر نظر رکھنا قدیم مورخوں کی کوتاہی ہے۔ سماج کی بھی بہت بڑی تعداد جب مل کر ایک چیز کو بناتی یا بگاڑتی ہے تو اس میں صرف ایک آدمی کے ارادے کا دخل نہیں ہوتا بلکہ ان تمام لوگوں کی خواہشوں اور تمناؤں کو دخل ہوتا ہے جو اس چیز کے بنانے یا بگاڑنے کی کوشش میں اپنی جانیں لڑا دیتے ہیں۔ اب چاہے ان لوگوں کی چھوٹی یا بڑی تعداد کے منشا خواہش اور ارادے کو کسی ایک شخص کے عمل اور ایک شخص کے قول نے ظاہر کیا ہو یا کسی ایک جماعت کے قول و عمل نے بہرحال وہ ایک سماجی عمل اور ردِ عمل اور عمل در عمل کا سلسلہ ہوتا ہے۔

ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ سماج کی چھوٹی یا بڑی تعداد یا کل سماج ایک

مخصوص زمانے میں مخصوص طریقے سے کیوں سوچتا ہے اور پھر یہ کیوں ہوتا ہے کہ سماج کے ایک حصے کی منشا، دوسرے حصے کی منشا کے خلاف ہوتی ہے اور اس کے خلاف عمل کرتی ہے۔

مارکس اور اینگلز کا زبردست کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے یہ راز دریافت کرلیا اور اسے ڈھائی تین ہزار برس کی انسانی تاریخ سے ثابت کر کے دکھا دیا۔ مارکسزم نے کہا کہ جو چیز آدمی کو حرکت میں لاتی ہے وہ اس کے دماغ پر ابھری ہوئی تصویر ہے۔ اور دماغ پر ابھری ہوئی تصویر خارجی حالات کی ہوتی ہے۔ اور خارجی حالات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے والی آدمی کی وہ معاشی جدوجہد ہے جو وہ فطرت کی سجائی ہوئی کائنات میں کرتا ہے۔ سماج کے جو معاشی حالات ہوتے ہیں زندگی کی ضرورت کا سروسامان پیدا کرنے کا جو طرز ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ سماج میں بسنے والے مختلف لوگوں کے جو پیداواری تعلقات ہوتے ہیں ان کے مطابق وہ اپنا نفع نقصان سوچتے ہیں۔ اگر سماج میں کچھ لوگوں کے معاشی حالات دوسروں سے مختلف ہیں تو ان کی تصویر یا پرچھائیں بھی ان کے دماغوں پر مختلف ہوگی اور اگر یہ تصویر یا پرچھائیں ایک گروہ کے دماغ پر بالکل ایک شکل سے آتی ہے اور دوسرا گروہ ہے جس کے دماغ پر وہ بالکل مختلف صورت میں آتی ہے تو دونوں کے جذبات، احساسات، تصورات مختلف ہوں گے اور پھر انھی کے مطابق ان دونوں گروہوں کا رجحان اور ان کا عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ اس طرح سے سماج میں طبقے بن جاتے ہیں اور طبقوں کا سبب ہوتا ہے معاشی تعلقات کا ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں مختلف ہونا۔ یعنی سماج کے اندر جو عمل اور سلسلۂ عمل کا

ایک سمندر جوش مارتا رہتا ہے اس کی تہہ میں انسانی سماج کا معاشی ڈھانچہ موجود ہے اور اسی معاشی ڈھانچے کے اندر مختلف گروہوں، مختلف ملکوں، قوموں، نسلوں یا طبقوں کی معاشی جد و جہد ہوتی ہے جو سماج کے اندر قوتوں کا اور ان کی فتح و شکست کا آخری فیصلہ صادر کرتی ہے۔

اس طرح سے مارکس ازم نے الجھی ہوئی گتھی کا اصل سرا پکڑ لیا ہے۔ یہ سرا ہے سماج کے اندر پیداوار کا طرز۔ مختلف طاقتوں یا طبقوں کی معاشی جد و جہد او معاشی تعلقات۔

"اپنی زندگی (مادی زندگی کی ضروریات اور ان کا سامان) سماجی طور پر (مل جل کر) تیار کرنے میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اس قسم کے تعلقات بنا لیتے ہیں جن پر قابو نہیں ہوتا اور جن کے بغیر کام نہیں چلتا۔ ایسے تعلقات قائم ہونے میں لوگوں کے ارادے اور سوچ سمجھ کو دخل نہیں ہوتا ہے (وہ آپ سے آپ ایسے بن جاتے ہیں) ان کی مادی سامان تیار کرنے والی طاقتوں کی (یعنی محنت کرنے والے، ان کا ہنر اور آلات) ترقی جہاں تک ہو چکی ہے اسی کے مطابق یہ پیداواری تعلقات ہوتے ہیں۔ اور سماج میں ان تمام پیداواری تعلقات کا جو مجموعہ ہوتا ہے وہی سماج کا معاشی ڈھانچہ کہلاتا ہے۔ معاشی ڈھانچہ ہے جو سماج کی اصلی بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر قانون اور سیاست کی اوپر والی منزلیں کھڑی ہوتی ہیں اور سماج کی سوجھ بوجھ اور شعور کی جو خاص شکلیں ہوا کرتی ہیں وہ اسی ڈھانچے کے مطابق ہوتی ہیں۔ مادی زندگی میں طرز پیداوا

ہے (یعنی محنت کرنے والے، ان کا ہنر، آلات، ذرائع پیداوار اور پیداوار کے سلسلے میں سماج کے ایک حصے کے دوسرے حصے سے تعلقات) جو لوگوں کی سماجی، سیاسی اور علمی سرگرمیوں کو عام طور سے اپنے اثر میں رکھتا ہے وہ چیز لوگوں کا شعور یا ان کی عقل نہیں ہے جو اُن کے (سماجی) وجود کا فیصلہ کرتی ہے اور اسے اپنے اثر میں رکھتی ہے بلکہ اس کے برخلاف یہ ہے لوگوں کا سماجی وجود (اور اس کے حالات) جو اُن کے شعور اور عقل کو اپنے اثر اور اپنے تحت میں رکھتے ہیں۔"

اسی بیان میں تشریح کرتے ہوئے مارکس نے بتایا ہے کہ:۔

"لوگوں کا ہُنر بڑھتا ہے۔ ان کا علم و تجربہ بڑھتا ہے۔ پیداوار کے ذریعے اور آلات معلوم کئے جاتے ہیں۔ لوگوں کی ضرورتیں بڑھتی ہیں جس کی وجہ سے سماج کی کل پیداواری طاقتیں بڑھ جاتی ہیں۔ لیکن اس سلسلے کے شروع میں تعلقات وہی چلتے رہتے ہیں جو پہلے تھے۔ نتیجہ یہ کہ پیداواری تعلقات یعنی ملکیت اور اقتدار کا معاملہ پُرانا ہوتا ہے اور پیداواری طاقتیں نئی ہوتی ہیں جس سے دونوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مطابق ہونا چاہتے ہیں، جب تک ان تعلقات کا ڈھنگ نہ بدلا جائے، ترقی یافتہ پیداواری طاقتیں اپنا کام پورا نہیں کر سکتیں ڈھنگ بدلنے کے لئے طاقت استعمال ہوتی ہے۔ دبا ہوا طبقہ یا طبقے اپنا نیا حق حاصل کرنے کے لئے طاقت استعمال کرتے ہیں، اسی کا نام ہے سماجی انقلاب۔"

"لہٰذا ثابت ہے کہ بنی نوع انسان صرف اسی کو اپنا فرض قرار دیتا ہے
جسے وہ پورا کر سکے کیونکہ اگر پورے معاملے کو قریب سے دیکھا جائے تو
معلوم ہوگا کہ کسی فرض کو انجام دینے کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا
ہے جب وہ مادی حالات پیدا ہو چکے ہوں جو اس کا تقاضا کرتے ہیں
یا اگر پیدا ہوئے نہ ہوں تو کم از کم پیدا ہو رہے ہوں۔"

(کارل مارکس کے منتخبات۔ جلد اول)

مارکس ازم دیکھتا ہے کہ مختلف زمانوں میں جتنے اصول، جتنے قوانین، جتنے دستور، جتنے ضابطے تراشے گئے، وہ خود سماج کو پیدا کرنے والے نہیں تھے بلکہ دراصل سماج کے اندرونی (معاشی) حالات کی پیداوار تھے۔ ریاست ہو یا اس کا قانون جُرم و سزا۔ فلسفہ ہو یا اس کا تراشا ہوا نظامِ اخلاق۔ مذہب ہو یا اس کے رسوم و عقائد، ادب ہو یا اس کے جمالیاتی نظریے۔ فن ہو یا اس کے تراشے ہوئے بُت۔ سب کے سب ایک ایسی عمارت کے نقش و نگار، کمرے اور کوٹھڑیاں ہیں۔ جو عمارت معاشی جدوجہد اور سماج کے اندر معاشی تعلقات کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ سماج کی اصل حقیقت دریافت کر لینے کے بعد یہ آسان ہو جاتا ہے کہ فلسفہ، نظامِ اخلاق، آرٹ، ادب، مذہب اور قانون کی سماجی تاریخ دریافت کی جائے اور بتایا جائے کہ فلاں دور میں جب سماج میں پیداوار کا طرز یہ تھا، آلات یہ تھے اور سماج اتنے طبقوں میں تقسیم تھا۔ معاشی حالات ایسے تھے تو فلاں طبقے کی خواہشات کیا ہوں گی اور اس کے رجحانات کیا رہے ہوں گے۔ اور ان کے مطابق اس طبقے کی جدوجہد نے کیا شکل اختیار کی ہوگی یا فلاں سبب پیدا ہو جانے سے وہ شکل کیسے بدلی ہوگی۔

مثلاً انیسویں صدی کی ابتدا تک میں مزدوروں نے سرمایہ داری کی لوٹ کے خلاف غصّے کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ مل کر مشینیں توڑ ڈالتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کی اصل دشمن یہ مشین ہے۔ لیکن شعور، تنظیم اور اتحاد اور مزدور تحریک پھیلنے کے بعد۔ اگرچہ ان کا وہ غصہ باقی رہا۔ لیکن اس کی شکل بالکل بدل گئی۔ اب اس کی جگہ منظم ہڑتالیں آگئیں۔ آگے چل کر معاشی ہڑتالوں کے ساتھ ساتھ سیاسی ہڑتالیں آگئیں اور مزدور اپنے غصّے کو سیاسی جنگ کی شکل میں ظاہر کرنے لگے۔ پھر محنت کشوں پر ظلم کے خلاف وہی غصہ جو رانگن کے علاقے میں ۱۸۴۰ء تک مشینوں کے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ سیاسی جنگ کرتے کرتے پارلیمنٹ تک پہنچ گیا اور وہاں اس نے تقریروں اور مطالبوں کی شکل اختیار کرلی۔ اور پھر اس نے ہتھیاروں کی باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کی اور مشینیں توڑنے کی بجائے اس نے مشین کو اپنا کر سرمایہ داروں کا مقابلہ شروع کر دیا۔

مختصر یہ کہ مارکس ازم اگرچہ سماجی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اپنی تحقیق اور تجزیے کا دائرہ پھیلاتا ہے اور وہاں بھی اس کی بنیاد وہی جدلیاتی اور تاریخی مادیت ہوتی ہے لیکن اس کے سامنے جو اہم سوال ہے وہ یہ کہ سماج کے اس معاشی ڈھانچے کو بدل دیا جائے جس میں خود مشقت کرنے والے اور دوسروں کی مشقت پر بسر کرنے والے طبقے برسرِپیکار رہیں۔ کیونکہ جب تک یہ ڈھانچہ موجود ہے، سماج دو بڑے طبقوں میں، اور پھر کئی طبقوں میں بٹا ہوا ہے پیداواری تعلقات میں اور پیداواری طاقتوں میں مناسبت نہیں ہے۔ جب تک دونوں میں مناسبت نہ ہو اس وقت تک سماج کو آگے بڑھنے کا اور انصاف

کو خوشحالی دینے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ جب تک قدرت کی عطا کی ہوئی نعمتوں پر اور انسان کی ہزاروں سال کی محنتوں کے ثمرے پر سماج کا ایک حصّہ قابض ہے اور دوسروں کو اپنا محکوم بنا کر اور انھیں محروم رکھ کر خود عیش کرتا ہے اس وقت تک انسانی سماج خود اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی دولت اور قدرت کی عطا کی ہوئی نعمت سے نہ پوری طرح فیض یاب ہو سکتا ہے، نہ اسے آگے بڑھا سکتا ہے۔

مارکس ازم کے نظریے، لینن ازم کے عمل اور کمیونزم کے پورے نظریے اور پوری تحریک کے سامنے جو اصل سوال ہے وہ یہ کہ سماج کے اندر پیداواری تعلقات بدلے جائیں۔ اصل سوال سماج کی بنیاد کا ہے۔ عمارت کے نقش و نگار اور بام و در کا سوال اس کے بعد آتا ہے۔

کمیونزم کی تحریک تمام دنیا کے محنت کشوں کو، چاہے وہ صنعتی مزدور ہوں، کسان ہوں، معمولی دوکاندار ہوں، ملازمت پیشہ لوگ ہوں، غریب دستکار ہوں، یا پولیس کے سپاہی۔ وہ جو اپنی محنت سے بسر کرتے ہیں اور جو سماج کے اجارہ دار طبقے کے ہیبت ناک بوجھ تلے پس رہے ہیں۔ ان سب کو صنعتی مزدوروں (پرولتاریہ) کی رہنمائی میں متحد کرتی ہے اور ان میں رنگ، نسل، مذہب، تہذیب اور قومیت کا کوئی فرق نہیں کرتی۔ کیونکہ جہاں تک محنت کشوں سے طبقاتی مفاد یا نقصان کا تعلق ہے، یہ تمام فرق کوئی معنی نہیں رکھتے۔ کمیونزم کی تحریک ان سب کو متحد کر کے حکمراں طبقوں کے خلاف صف آرا کرنا اور اقتدار چھین کر ایک آزاد

اشتراکی سماج قائم کرنا چاہتی ہے جو آگے چل کر بے طبقہ سماج میں ڈھل جائے۔

کھلی بات ہے کہ اس تمام پروگرام میں ابتدار سے انتہا تک کہیں بھی مذہبی عقائد کا سوال پیش نہیں آتا۔ اور مذہب صرف افراد کے ذاتی عقیدے پر منحصر رہ جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کمیونزم خود کوئی ویسا عقیدہ نہیں ہے جیسے اب تک آتے رہے ہیں۔ اس نے "اعتقادِ محض" کی تمام بندشوں اور تمام الجھاووں سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے

"ملکیت اور جائداد کے جو تعلقات چلے آتے تھے، کمیونسٹ انقلاب نے بہت آگے جا کر ان سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ یہ ان سلسلوں کا ایک انقلابی توڑ ہے۔ اس لئے تعجب کی بات نہیں جو وہ آگے بڑھتے بڑھتے پرانے تصورات سے بھی اسی انقلابی طریقے سے اپنا رشتہ توڑ ڈالے۔"

(کمیونسٹ مینی فیسٹو۔ مارکس۔ اینگلز)

مذہب سماجی تاریخ کی روشنی میں

(اعتقاد اور سائنس کا فرق)

مذہب صرف چند اعتقادات کا نام نہیں ہے بلکہ ہر ایک مذہب سماجی زندگی کی کچھ شکلیں بھی پیش کرتا ہے۔ اس اعتقاد اور عمل کے درمیان ایک اندرونی اور گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ مارکسزم نے جدلیاتی مادیت کے فلسفے سے جہاں جسمانیات، مادہ اور روح، شعور اور وجود کی حقیقتوں کا پتہ لگایا ہے وہیں اس نے تاریخ کی مختلف منزلوں میں سماجی رشتوں کا اور اعتقادات سے ان کے گہرے تعلق کا راز بھی دریافت کیا ہے۔ مارکسزم نے ثابت کیا ہے کہ یہاں بھی جدلیات کا وہی عمل کام کر رہا ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں میں موجود ہے اور اس طرح سے مارکسزم نے مذاہب کو صرف اعتقادات کا مجموعہ سمجھ کر ان پر حق اور باطل ہونے یا فلسفیانہ نظریے سے صحیح یا غلط ہونے کا حکم نہیں لگایا۔ مذہبی اعتقادات کی بنیادوں کو انسان کی سماجی تاریخ سے الگ کر کے نہیں دیکھا بلکہ انھیں پورے سماجی ارتقار کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس میں بھی وہی

ارتقار کا عمل پوشیدہ ہے۔ انسان کے مادّی حالات اور شعور نے جہاں اپنی اپنی ترقی کی مختلف منزلوں میں دوسرے اداروں کو جنم دیا ہے وہیں مذہب بھی بنائے ہیں۔ ہر طبقے اور ہر سماج نے اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق بنائے ہیں اور انھیں اپنی ضرورت اور سہولت کے مطابق ڈھالا ہے۔

مذاہب کی حقیقت معلوم کرنے کی اس کوشش میں کمیونزم کے فلسفے کا رویہ ایسا ہے کہ اس میں جستجو اور تحقیق پائی جاتی ہے۔ عناد اور محض تردید نہیں۔

کمیونسٹ نظریے اور عمل کے دشمن (جس میں نادان دوست اور دانا دشمن دونوں شامل ہیں) یہ بتانے کے لئے کہ کمیونزم کی لڑائی مذہب سے ہے، زیادہ تر کارل مارکس کے اس جملے کو دہراتے ہیں کہ "مذہب عوام کے لئے افیم ہے"۔

صحیح ہے کہ یہ جملہ کارل مارکس کا ہی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے تحقیق، جستجو دلائل اور حقائق کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے۔ مارکس نے یہ بات اس طرح کہی ہے کہ:-

مذہب کے روپ میں جو دکھ (Misery) اور مصائب ہیں اس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رخ تو یہ ہے کہ انسان پر جو زیادتی اور جبر ہوا ہے جو مصائب گزرتے ہیں، یہ ان کا اظہار ہے۔ دوسرا رُخ یہ کہ مذہب ان مصائب کے خلاف زیادتی اور جبر کے خلاف احتجاج اور پروٹسٹ ہے۔ مذہب دبی کچلی مخلوق کی ایک آہ ہے یہ بے درد دنیا کی ایک دردمندی ہے اور بے حسی کے حالات کا ایک جذبہ ہے۔ یہ عوام کی افیم ہے۔

"Religions misery is, on the one

hand, the expression of actual misery, and, on the other, a protest against actual misery. Religion is the sigh of the oppressed creatures, the kindliness of a heartless world, the spirit of unspritual condition. It is the people's opium."

(Capital)

ان جملوں کا اگر پوری طرح تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب کو ایک طرف "عوام کی افیم" اور دوسری طرف "دکھ، مجبوری اور مصائب کے خلاف آواز" کہہ کر مارکس نے انسانی تاریخ کی کتنی عظیم اور بے پناہ سچائی کو چند لفظوں میں سمو دیا ہے۔

مارکسی فلسفے اور کمیونسٹ عمل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ مارکس ازم یا کمیونسٹ تحریک کی اصل لڑائی مذہب سے ہرگز نہیں ہے اور نہ کمیونسٹوں کا اصل مقصود یہ ہے کہ مذہب کو، مذہبی اداروں کو اور مذہبی اعتقادات رکھنے والوں کو ایذا دی جائے، ان سے جنگ مول لی جائے۔ اور ان کو اپنا اصل حریف سمجھا جائے۔

مارکس ازم نے مذہب کو سماجی زندگی اور اس کے مختلف دوروں کی تاریخ میں اس طرح دیکھا ہے کہ ——— انسانوں کا سماج، جب سے اس کا پتہ چلتا

ہے، آج تک تین منزلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک بالکل ابتدائی سماج جس میں طبقوں کا وجود ہی نہ تھا۔ لوگوں کو خبر نہ تھی کہ پیداوار بڑھائیں کیسے۔ دوسرا طبقہ دارانہ سماج۔ جو پہلے غلام رکھنے اور ان کی خرید فروخت کرنے سے شروع ہوا۔ جاگیرداری طرز میں ڈھلا اور پھر سرمایہ داری نظام تک پہنچا۔ سرمایہ داری اور سامراج طبقہ داری کی آخری شکلیں ہیں۔ اور تیسرا بے طبقہ سماج، جب کہ ایک دوسرے کے مخالف طبقے مٹ جائیں گے اور پورے سماج میں ایک ہی طبقہ رہ جائے گا۔

اس بالکل ابتدائی اور طبقوں کے وجود سے پہلے کے سماج میں آدمی بہت بے بس تھا۔ کوئی آدمی اپنی ساری محنت اور شب و روز صرف کر کے بھی اس قابل نہ ہوتا تھا کہ اتنا سامان حاصل کر لے جس سے وہ خود بھی بسر کر لے اور کچھ بچا بھی لے۔ اور چونکہ کچھ بچتا نہ تھا اس لئے کوئی دوسرا شخص اسے قبضا نہیں سکتا تھا۔ اور چونکہ دوسرے آدمی کی محنت سے حاصل کئے ہوئے سامانِ خورد و نوش وغیرہ سے دوسرا آدمی حصہ نہیں بٹا سکتا تھا اس لئے ہر شخص کو اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے خود محنت کرنی پڑتی تھی لہٰذا طبقوں کا وجود نہیں تھا اور انسان طبقوں کے تصور سے ناآشنا تھا۔ جسمانی قوت کے علاوہ آدمیوں میں اونچ نیچ کا کوئی احساس نہ تھا اور کوئی شخص یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ وہ خود مجبور رہے۔ اور دوسرا شخص بااختیار رہے۔

اس بالکل ابتدائی سماج میں آدمی نے دیکھا کہ اگر وہ کسی قوت کے سامنے مجبور ہے تو وہ فطرت کی قوت ہے۔ وہ شکار کی تلاش میں سفر کرتا ہے تو اوپر سے موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے اور اس کا ارادہ ناتمام

رہ جاتا ہے۔ وہ شکار کا پیچھا کر رہا ہے کہ آندھی آجاتی ہے اور شکار نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کبھی دھوپ کی تپش اس کے کام میں حائل ہو جاتی ہے اور کبھی موسم کی تبدیلی خود اس کے پاس شکار اور پھل پھول لے آتی ہے۔ چنانچہ اپنی سمجھ کے مطابق اس نے بااختیار اور اپنی دست رس سے باہر کی طاقتوں کو حسبِ منشا بنانے اور راضی کرنے کے لئے وہ حرکتیں شروع کیں جنھیں بعد میں جادو کا نام دیا گیا ہے۔ جادو کے کرتب دراصل نادیدہ طاقتوں کو انسان کی ضرورت اور خواہش کے مطابق بنانے کے لئے انسان کی سب سے پہلی کوشش تھی اور آج تک جہاں جہاں قدیم سماج کی جھلکیاں باقی رہ گئی ہیں وہاں جادو کی اہمیت بھی اسی طرح باقی ہے۔

جادو کے کرتبوں کا مفہوم ابتدا میں بالکل یہ تھا کہ اگر طاقت کو سازگار بنانے کا ارادہ اور عمل کیا جائے تو انھیں ہموار کیا جا سکتا ہے۔ یہ مفہوم آدمی نے اپنے تجربے سے سیکھا تھا۔ کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ ہاتھوں، ٹانگوں اور جسم کے دوسرے حصوں کو اپنی سہولت کے مطابق ڈھالنے میں اس کے ارادے اور کوشش کو بڑا دخل ہے۔ چنانچہ جادو کے زور سے کام لیا جانے لگا۔ یہ تصور دو وجہوں سے مضبوط ہوتا گیا۔ ایک تو یہ کہ جب کبھی اتفاق سے فطرت کا عمل آدمی کی خواہش کے مطابق ہوا وہ یہی سمجھا کہ یہ اس کے جادو کا اثر ہے۔ دوسرے یہ کہ جادو کا عمل کرنے کے بعد اسے اپنی قوتوں کے بڑھ جانے کا آسرا ملنے لگا۔ اور اس خیال کی وجہ سے اس کی قوتِ کارکردگی بڑھتی گئی۔ گویا جادو منتر — جو پوجا پاٹ کی رسوم کی ابتدائی شکل ہے۔ دراصل تسخیرِ فطرت کے لئے اور قدرت کی

بے پناہ اور بے محابا طاقتوں اور مظاہر کو رام کرنے کے لئے آدمی کی اولین کوشش ہے اور اس کی بدولت زیادہ سامانِ خورد و نوش حاصل کرنے کے لئے انسان کا حوصلہ بڑھتا گیا ہے۔

اس وقت نہ آدمی کو خدا کا کوئی تصور تھا، نہ دیوی دیوتاؤں کا نہ قربانی دینے کا، نہ عبادت کرنے کا۔ صرف جادو تھا۔ آدمی فطرت کی جلاد قوتوں سے ڈرتا بھی تھا۔ انھیں خوش بھی کرنا چاہتا تھا اور انھیں اپنی سہولت کے مطابق ڈھالنا بھی چاہتا تھا۔ ان جذبوں کی تسکین ابتدا میں تو جادو سے ہوتی رہی۔ لیکن بعد میں جب کام زیادہ ہونے لگا آدمی کو فطرت کے دستور اور اس کی طاقتوں کے ابتدائی اصول معلوم ہونے لگے تو اس کی وجہ سے ایک طرف تو پیداوار کچھ بڑھی۔ جانور آسانی سے شکار ہونے لگے، انھیں پالا جانے لگا۔ ان کا دودھ کام آنے لگا۔ ہوا چلنے، پانی برسنے، دھوپ پڑنے، پھل پکنے اور پودے اُٹھنے کا وقت اور ان کا ابتدائی طریقہ معلوم ہوگیا اور دوسری طرف آدمی کے علم میں اضافہ ہوا۔ اور فطرت کی طاقتوں کو اپنے رُخ پر لانے کی دو شاخیں کھل گئیں۔ ایک کی بنیاد علم تھا۔ دوسرے کی بنیاد لاعلمی۔ ایک کی بنیاد آدمی کا تجربہ، تلاش اور قدرت تھی۔ دوسرے کی بنیاد اعتقاد، گمان اور بے بسی، ایک کی بنیاد حضور تھا، دوسرے کی غیب۔ پہلی شاخ میں سائنس کا پھل آیا۔ اور دوسری شاخ میں مذہب کا۔ لیکن دونوں شاخیں بہر حال ایک ہی جڑ سے پھوٹی تھیں اور ابتدا میں دونوں ایک دوسری سے ہم آغوش تھیں اور ایک عرصے تک اسی طرح بڑھتی رہیں۔

فطرت کی بے رحم اور قادرِ مطلق طاقتوں کے متعلق آدمی کے تجربے نے اسے جیسے جیسے علم دیا، ویسے ہی وہ معلوم کے سہارے نامعلوم کی طرف بڑھتا گیا کہیں کہیں اس نے اپنی محنت کے طریقوں کو فطرت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا اور کہیں فطرت کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے تقاضوں کے مطابق سدھالیا۔ بہر حال دونوں طریقوں سے پیداوار بڑھی اور اتنی بڑھی کہ محنت کرنے والوں کی بسر ہونے کے علاوہ کچھ بچنے بھی لگا اور اس کا امکان پیدا ہوا کہ بچے ہوئے سامان یا بچی ہوئی محنت کو لیا دیا جا سکے۔ اور یہیں سے سماج طبقوں میں دھیرے دھیرے نامحسوس طور پر بٹنا شروع ہو گیا۔ ایک طرف محنت کرنے والے اور دوسری طرف محنت لینے والے۔

ابتداء میں یہ فرق اتنا محسوس اور واضح نہیں تھا۔ جو لوگ کل تک جادوگر تھے، ان کے علم اور ان کی خدمات، فطرت کے متعلق ان کے تجربے اور "کنٹرول" کا احترام بڑھا اور خود سب کے برابر محنت کرنے کی بجائے وہ دوسروں کی محنت پر بسر کرنے والے محترم شرفا اور خاندان یا قبیلے کے "بڑے" سمجھے جانے لگے۔ ان کا کام صرف جادو کرنا، جادو کے ذریعے اپنے لوگوں کے مشترکہ مفاد کے لیے خدمات پیش کرنا اور انھیں ہدایت دینا رہ گیا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کام کی تقسیم شروع ہو گئی جو اس کے بعد طبقہ واری سماج کے لانے کا ایک سبب بنی اور طبقہ واری سماج کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی۔

یہ بات بے وجہ نہیں ہے کہ انسانی سماج کی قدیم نسلوں (سامیوں اور آریوں) کی پرانی تاریخ اور مذہبی کتابوں میں آج تک جادوگروں اور جادوگری

کے اقتدار کا ذکر موجود ہے۔ توریت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ اس وقت دنیا میں آئے جب جادوگروں کا زور تھا اور لوگ ان کے حکم اور ان کے اشاروں پہ چلتے تھے۔ اور فرعون کے متعلق توریت اور قرآن میں یہ روایت آئی کہ وہ مصر کا جابر بادشاہ تھا۔ تمام جادوگروں کا سردار تھا اور اپنے آپ کو خدا کہتا اور کہلواتا تھا (جادوگر، بادشاہ اور خدا کا یکجا ہونا ایک تاریخی حقیقت ہے) حضرت موسیٰ نے ان کے اقتدار کو (یہ ذکر وادیٔ نیل کا ہے جہاں قدیم ترین تہذیب کے نشانات ملتے ہیں) توڑا اور ان سب سے زیادہ حیرت ناک معجزے (یا رائج الوقت زبان میں جادو) دکھا کر یہ تعلیم دی کہ انسانوں کی طاقت سے اوپر خدا کی طاقت موجود ہے۔

اس وقت تک جو احترام جادوگر یا خاندان کے سردار سے وابستہ تھا وہ اب انسان سے بالاتر قوت خدا سے منسوب ہونے لگا۔ گویا ان دیکھی قوتوں کے بارے میں فکر کرتے رہنے سے ان دیکھے خدا کا تصوّر بہت بعد کی پیداوار ہے۔ پہلے یہ تصوّر عام ہو چکا تھا کہ حیرت انگیز کرشمے دکھانے والا کسی ان دیکھی قوّت کا نمائندہ ہے۔ موسیٰ کے پیغام نے خدا کو انسان سے جُدا کیا۔ خُدا کے نمائندے یا اوتار ہی بالکل ابتدائی مذہبی عقائد کے رہنما اور مذہبی معاملات کے ذمہ دار بن گئے۔ وہی سماج کے اصول بنانے لگے اور اپنے حکم کو سماج کے مفاد کا سبب بتانے لگے۔ اس سے ایک طرف تو یہ ہوا کہ محنت کرنے والوں کو یہ احساس ہوا کہ اس وسیلے سے ان کا

رشتہ اور معاملہ زبردست طاقتوں سے بڑھتا جارہا ہے، اس یقین و اعتماد کے ساتھ ساتھ دوسری طرف پیداوار بڑھی اور پیداوار کے ساتھ ان کا تجربہ بڑھا اور دریافت بڑھی، دوسری طرف فطرت کی جابر طاقتوں سے رشتہ قائم کر لینے کے تصور کی بدولت پجاریوں کے اور سرداروں کے اس گروہ کا اقتدار بھی مضبوط ہو گیا۔ اور سماج کے اندر سے ایک نئی طاقت اُبھری اور اس نے اپنے قدم جمالئے۔ یہ تھی دوسروں کی محنت پر بسر کرنے والوں کی طاقت، جس نے ان جانے دیوتاؤں اور جانے پہچانے لوگوں کے درمیان خود کو رشتہ یا وسیلہ بنالیا۔ سائنس اور اعتقاد دونوں کو مٹھی میں لے کر۔

"جادو کی ٹکنک (فنی ترکیبوں) کو حاکم طبقے نے آگے بڑھایا اور یہ کہہ کر کہ انسان کی طاقت سے بالاتر قوت کی منظوری اسے حاصل ہے۔ حاکم طبقے نے اسے اپنی برتری اور اپنے خاص حقوق کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس طرح سے وہ لوگ جو محنت مشقت کرتے تھے دبتے چلے گئے اور اپنے دب جانے کا سبب جانے بغیر وہ اپنی مشکلات پر صبر شکر کرنے لگے اور اپنے حالات سے نبھانے لگے۔ مذہب اس خمیر سے تیار ہوا ہے۔ جادو کا اپنی حدوں سے آگے بڑھ جانا مذہب ہے اور وہ طبقاتی کش مکش کے ساتھ ابھرا ہے۔ یہ سماجی حقیقت کی ایک معکوس تصویر (Inverted image) ہے۔ جس طرح جادو نظریات

کی قوتوں کے سامنے ابتدائی انسان کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح مذہب سماج کے مقابلے میں تہذیب یافتہ انسان کی کمزوری کی حقیقت پیش کرتا ہے۔"

(مارکسی نقاد جارج تھامسن)

یہ ہے ابتدائی تصویر۔ شکار اور جانور پالنے اور چرانے کے اس زمانے میں زمین کی قوتِ پیداوار کے راز دریافت ہوئے اور قبائلی خانہ بدوشی کی زندگی کی جگہ ایک جگہ خیمے ڈال کر یا بستیاں بسا کر رہنے سے سماج ایک قدم اور آگے بڑھا۔ مردوں نے عورتوں کو کاشتکاری کا کام سونپا اور خود شکار کرنے یا مویشی چرانے میں زیادہ وقت دینے لگے جو بھاگ دوڑ کا کام تھا۔ عورت کا زمین سے یہ پہلا رشتہ ایسا تھا جس نے عورت کو زمین کی طرح مقدس اور قابلِ احترام بنا دیا۔ زمین کی کاشت کا یہ تصور آدمی کے ذہن میں عورتوں کے بطن سے بچے پیدا ہونے کے ساتھ آیا تھا۔ اور وہ اسی التزام کے ساتھ عرصے تک باقی رہا ابتدائی سائنس نے زمین کی قوتِ پیداوار اور کاشت کی تکنیک، موسموں کا حال، فصل کی ضروریات دریافت کیں تو اعتقاد اور تصور نے زمین اور عورت کے تقدس کو ایک ساتھ جوڑ دیا۔ زمین سے دانہ پھوٹنے کے وقت وہی جنتر منتر پڑھے جانے لگے جو بچے کی پیدائش کے وقت پڑھے جایا کرتے تھے اور جیسے سردار قبیلہ کے زینے سے ہو کر آدمی کا ذہن دیوتا تک پہنچا تھا۔ اسی طرح زمین سے اناج اور پھل پھلواری اگانے والی اور نسلِ انسانی کو آگے بڑھانے والی عورت کے زینے سے انسانی خیال نے دیوی کو پالیا۔ دیویوں کا

احترام دیوتاؤں سے بڑھ گیا (کیونکہ عورت کی خدمات معاشی زندگی میں مردوں سے زیادہ اہم اور زیادہ مفید تھیں) قدیم مصر، روم اور آریائی مذاہب میں جو دیویوں کی پوجا کا دستور پایا جاتا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے اور دیوتا کی عظمت بھی دیویوں کے کسی رشتہ دار کی حیثیت سے باقی رہ گئی۔

بستیاں بسیں تو زمین کی پیداوار اور حلقۂ کاشت پر جھگڑے شروع ہوئے۔ اور ایک زمانے کے بعد جب یہ جھگڑے باقاعدہ خونریزیوں اور جنگوں کی شکل اختیار کر گئے تو سماج میں وہ طبقہ بااقتدار ہوا جس کا پیشہ جنگ کرنا (دشمنوں سے حفاظت کرنا) رہ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جنگی صفوں میں مردوں نے اپنے جوہر دکھائے اور چونکہ معاشی زندگی میں فن جنگ کی اہمیت بڑھ گئی تو عورتیں پچھلی صفوں میں چلی گئیں اور اس طرح سے بعد کے مذاہب میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہ گیا جو کاشتکاری کی ابتدائی دریافت کے زمانے میں تھا۔

جنگ میں جو لوگ مغلوب ہوتے تھے انھیں پہلے قتل کیا جاتا تھا لیکن جہاں جہاں کاشتکاری پھیلتی گئی وہاں انھیں غلام بنایا جانے لگا۔ کیوں کہ ان کی محنت زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے میں مدد دے سکتی تھی۔ اور اس طرح غلام بھی خریدنے اور بیچنے کی جنس بن گئے۔ غلاموں کی خرید فروخت اور غلام داری سماج کا زمانہ کافی طویل ہے۔ اس زمانے میں بستیاں اور قصبات پھیلے۔ تجارت بڑھی۔ کپڑے بننے، نقش و نگار بنانے، برتن تیار کرنے کی دستکاری پھیلی۔ چھوٹی چھوٹی جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں۔ قانون بنے الگ الگ انتظامی شعبے قائم ہوئے اور شہریت کے ضابطے عمل میں آئے۔

سماج ترقی کی اس منزل پر پہنچ کر کئی صدیاں گزار چکا تھا اور چھوٹی جمہوری سلطنتوں کا تجربہ ناکام ہو چکا تھا کہ ان کے ملبے سے رومن سلطنت نمودار ہوئی۔ رومن سلطنت کے زمانے میں پہلی بار چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر ایک بڑی سلطنت میں ضم ہوگئیں اور فارغ البالی کا ایک ایسا وقت آگیا جس نے صرف عیش و عشرت کرنیوالے آقا طبقے کو جنم دیا۔ رومن کی شاہی سلطنت قائم ہونے کے کچھ عرصے بعد سماجی ارتقار کی جو منزل تھی وہ جارج تھامسن کے لفظوں میں مختصر طور پر یہ ہے کہ:۔

"پیداوار کی موجودہ سطح وہ تھی کہ اس میں غلاموں کی محنت مشقت آزاد لوگوں کی محنت مشقت سے زیادہ نفع بخش تھی۔ مگر غلاموں کی پیداوار بڑھانے کی یا اپنے فن میں ترقی دکھانے کی کوئی اُمنگ نہ تھی۔ جہاں تک جب تک غلام سستے ملتے رہے نئی ایجادوں کی ضرورت پیش ہی نہ آئی۔ ایک تو اس لئے کہ نئی ایجاد کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، دوسرے اس لئے کہ جو آقا تھے انھیں کاشت کاری وغیرہ کا کوئی تجربہ نہ تھا وہ عیش و عشرت میں پڑے رہتے تھے۔ حد یہ ہے کہ جب غلاموں کی محنت مشقت منافع کا سودا نہیں رہ گئی تب بھی آقاؤں نے خود کام میں ہاتھ نہیں ڈالا کیونکہ محنت کرنا ایسا ناگوار بوجھ تھا کہ جسمانی محنت ذلیل پیشہ بن گئی تھی اور اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ رومن سلطنت ایسے دور میں داخل ہوگئی جب آہستہ آہستہ معاشی زوال آنے لگا اور تہذیبی اور روحانی تنزل شروع ہوگیا"

غریبی اور دولت مندی کی دو انتہاؤں میں سماج بٹ چکا تھا۔ اندرونی خلفشار

برپا تھا جب رومن سلطنت کے کنارے پر بسے ہوئے جنگی قبائل نے ہاتھ پاؤں نکالے، اور رومن سلطنت کے آخری لمحے نظر آنے لگے۔ ان حالات میں یہ بات بالکل قدرتی تھی کہ فنا پسندی کا لب ولہجہ اور صلح کل کا برتاؤ لئے ہوئے مسیحیت نمودار ہوئی۔

سماج کو آگے بڑھانے کے لئے غلاموں کے سر کا بوجھ کم کرنا۔ انہیں پہلے سے برتر مقام دینا تھا۔ سلطنت کی مضبوط گرفت کو ہٹانا اور اس کی سب سے بڑی جکڑبندی کو توڑنا تھا۔ غلام و آقا کی تمیز کم کرنی تھی۔ سلطنت کے جبر و قہر کا اثر کم کرنا تھا تاکہ ان سے وہ سماج پیدا ہو جس میں رکی ہوئی اور دبی ہوئی پیداواری طاقتیں آگے بڑھیں۔ بے بس طبقے کو آگے بڑھنے میں مدد ملے۔ دستکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں کے ابھرنے کی راہ ہموار ہو۔ مسیحی عقائد نے سماج کے مجبور اور مظلوم، دبے ہوئے لوگوں کو صبر و شکر کی تلقین کی۔ انہیں جنت کی راہ دکھائی طبقات کے ٹکراؤ کی بڑھتی ہوئی شدت کو کم کیا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس نے سماج کو ایسے ڈھرے پر ڈالنا چاہا کہ چھوٹے چھوٹے خطوں میں بٹی ہوئی بستیاں پھر سے طاقت ور ہوں اور کھیتی، بیوپار اور دستکاری میں غلامی کے بوجھ سے آزاد ہونے والے کھپ جائیں۔ سماج زیادہ وسیع پیمانے پر اپنا تانا بانا پھیلا سکے۔

جب رومن سلطنت کی مشرقی سرحد پر پھیلے ہوئے جنگی قبیلوں نے متحد ہو کر پے در پے حملہ کیا اور رومن سلطنت کے پرخچے اڑنے لگے اور حاکم طبقے کو سخت حالات کا سامنا ہوا تو وہی مسیحیت تھی جس کا طبقاتی رخ بدل گیا اور وہ مظلوم اور غلام طبقے کی آواز ہونے کی بجائے اب حاکم طبقے کا مذہبی نظریہ بن گئی۔

وسیع رومن سلطنت کا زوال اور نئی سماجی قوتوں کا ابھرنا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ غلامی اپنی پہلی صورت میں ٹوٹ گئی۔ نظریاتی لحاظ سے مسیحیت کے عقیدے نے اور عملی لحاظ سے سرحدی قبائل کے حملوں نے، غلاموں کی بغاوت نے اور کھیتوں کی نئی تقسیم نے غلامی اور آقائی کے پرانے دستور کو توڑا اور اس کی جگہ رعایا اور جاگیر دار کا وجود ہوا۔ رعایا خریدی اور بیچی نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے کچھ حقوق تھے اور فرائض۔ زمین جاگیر دار کی تھی لیکن کاشت کا حق باقی رکھنے کے لئے رعایا کی طرف سے پیداوار کا ایک حصہ جاگیر دار کو پیش کیا جاتا تھا۔ رعایا زمین سے وابستہ تھی۔ مگر غلاموں کی طرح نہیں۔ کھیت پر اس کا قبضہ بھی تھا اور محدود حقوق بھی۔ اس سے چھوٹے چھوٹے کھیت وجود میں آئے۔ غلام ناپید ہوئے تو اب ضرورت پیش آئی کہ پیداوار کے نئے ذرائع دریافت ہوں۔ اور فنی ترقی کی جائے۔ چناں چہ اس ضرورت نے جہاں کاشتکاری میں نئی راہیں کھولیں وہاں دستکاری پر بھی زور دیا جانے لگا۔ وہ معاشی زندگی کے ایک علاحدہ شعبے کی حیثیت سے ترقی کرنے لگی۔ سماج ایک زینہ اوپر چڑھا اور اس زینے پر چڑھنے میں مسیحیت نے بھی سہارا دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مسیحیت کے ابتدائی عقیدہ اور عمل کی طنابیں کٹ چکی تھیں۔ سب سے پہلے پادریوں نے اس اصول کو توڑا تھا کہ خدا کے سامنے سب مخلوق برابر ہے۔ پادری عام دستکاروں کے اور رعایا کے مقابلے میں خدا سے بھی زیادہ قریب تھے۔ ان کی اپنی جاگیریں تھیں۔ چرچ خود بڑا جاگیر دار تھا اور جاگیر داروں سے ان کا مستحکم رشتہ بھی تھا۔ اس طرح سے جاگیر داری، چرچ، کلیسائی نظام جو فطر

کی نہیں بلکہ سماج کی پیداوار تھا بجائے خود ایسی قوت بن گیا جو فطرت کی بے رحم اور قادرِ مطلق طاقتوں کی طرح ناقابلِ شکست اور عام مجبور انسانوں کی بھی دست رس سے بالاتر نظر آنے لگا۔

جاگیرداری کے اس سماج کی عمر بھی بہت طویل ہوئی ہے۔ یورپ اور شمالی افریقہ میں اگرچہ وہ پہلے ٹوٹا لیکن ایشیا میں اب تک اس کے بچے کھچے آثار موجود ہیں۔ اس تمام عرصے کی سماجی تاریخ اور اس کے مذہبی رول کے بارے میں اینگلز کا بیان ایک پورے دفتر سے زیادہ جامع ہے۔

ہیگل کے بعد اور مارکس سے پہلے کے فلسفی لڈوِگ فیورباخ کے فلسفے پر تبصرہ کرتے ہوئے اینگلز نے مذہب کی سماجی اور تاریخی حیثیت کے بارے میں روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ مارکس اور اینگلز کی تحقیق اس سلسلے میں کیا ہے:

"مذہب بالکل ابتدائی زمانوں میں انسانوں کے ان ابتدائی مگر بے بنیاد خیالات سے پیدا ہوا جو وہ اپنی فطرت اور اپنے چاروں طرف کی بیرونی فطرت کے متعلق رکھتے تھے۔ ہر ایک نظریہ جب وہ ایک بار پیدا ہو چکتا ہے تو جو حالات و تصورات کا مسالہ (مواد) (Concept material) اس کے پاس ہوتا ہے اسی کے مطابق وہ آگے بڑھتا ہے اور اس کو خود آگے بڑھاتا ہے۔"

...." وہ لوگ جن کے دماغوں میں خیال اور نظریات کا سلسلہ اپنا کام کرتا رہتا ہے ان کی مادّی زندگی کے حالات ہیں جو در اصل یہ طے کرتے ہیں کہ اُن کے خیال کا رُخ اور رفتار کیا ہو گی۔ لیکن

یہ راز ایسا ہے کہ جو خود اس سے واقف نہیں ہوتے۔ ورنہ اگر
وہ واقف ہو جائیں تو سارے نظریوں کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔

چناں چہ مذہب کے جو ابتدائی تصورات تھے اور جو شروع شروع کے مختلف لوگوں کے ہر ایک گروہ (قوموں نسلوں اور مذہبوں وغیرہ) میں ایک جیسے ہیں جب وہ گروہ الگ الگ ہو جاتے ہیں تو ان میں اپنے اپنے یہاں کے حالات کے مطابق اور ہر گروہ کے لوگوں کے تقاضوں کے مطابق پھیلتے اور بڑھتے ہیں۔ اکثر قوموں اور نسلوں کے لوگوں میں، خاص طور سے آریوں (ہند یورپی نسل) میں اس کا سلسلہ دیکھنا ہو تو ان کی دیومالا (مائتھولوجی) سے ظاہر ہے ان میں سے ہر ایک کے دیوتا اس سے وضع کئے گئے تھے کہ وہ قومی دیوتا تھے ان کی خدائی بس وہیں تک تھی جہاں تک اس قوم کا اپنا علاقہ تھا اور جس علاقے کی حفاظت اسے کرنی ہوتی تھی۔ سرحد کے اس پار سے دوسرے دیوتاؤں کی خدائی شروع ہوتی تھی وہ لوگوں کے تصور میں اسی وقت تک باقی رہتے تھے جب تک کہ وہ قوم باقی رہتی تھی اور قوم کے ساتھ ان کا بھی زوال ہوتا تھا عالمگیر رومن سلطنت پرانی قومیتوں کا زوال اور ان کا خاتمہ لے کر آئی۔ تو پرانی قوموں کے دیوتا بھی ختم ہو گئے اور خود قدیم رومیوں کے دیوتا بھی گئے۔ کیوں کہ وہ بھی صرف شہر روم کی چار دیواری تک کے لئے موزوں کئے گئے تھے مگر عالم گیر سلطنت کے ساتھ ساتھ عالم گیر مذہب کی ضرورت کتنی تھی یہ اس سے ظاہر ہے کہ روم میں غیر ملکی دیوتاؤں کے ساتھ احترام کا مقام عطا کیا گیا لیکن سرکاری فرمان کے ذریعے نیا عالم گیر مذہب قائم ہونے سے رہا۔ ایک

نیا عالم گیر مذہب یعنی عیسائی مذہب وجود میں آچکا تھا یہ مذہب ایک مرکب تھا جس میں ایک تو مشرقی، خاص طور سے یہودی فقہ اور شریعت کے موٹے موٹے اصول تھے اور دوسرے یونانی فلسفے خاص طور سے سٹوئک (رواقی) فلسفے کے بگڑے ہوئے اصولوں کی آمیزش تھی۔ ابتدا میں مسیحیت کی صورت کیا رہی ہوگی، یہ ایسی چیز ہے کہ بڑے غور و فکر اور جستجو کے ساتھ اس کا پتہ پھر سے چلانا پڑے گا۔ کیوں کہ جو عیسائیت ہم تک پہنچی ہے وہ اس وقت کی ہے جب وہ سرکاری مذہب بن چکی تھی۔ اور اسی مقصد کی خاطر کونسل آف نکائیا نے اسے اپنا لیا تھا۔ عیسائی مذہب وجود میں آنے کے صرف ڈھائی سو برس بعد سرکاری مذہب بن گیا۔ یہ تنہا واقعہ ایسا ہے کہ اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ مسیحی مذہب وہ مذہب تھا جو اس زمانے کی ضرورت اور حالات کے مطابق تھا۔ اور پھر جب درمیانی عہد میں جاگیرداری پھلی پھولی تو مسیحیت اس کی مذہبی ہم زاد بن گئی۔ اور جب تجارت پیشہ دولت مندوں نے ابھرنے کے لئے زور لگایا اور اس کا سامنا پرانی جاگیردارانہ کیتھولک مسیحیت سے ہوا تو اس کے مقابلے میں پروٹسٹنٹ مسیحیت کی شاخ بڑھی۔ یہ مذہب جنوبی فرانس کے ان لوگوں میں سب سے پہلے نمودار ہوا (بارھویں، تیرھویں صدی عیسوی) جو کیتھولک عیسائیت کے خلاف تھے اور اس وقت نمودار ہوا جب شہروں کی آبادی اور خوش حالی اپنی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔

درمیان کا جو طویل جاگیرداری عہد گزرا ہے اس میں نظریات اور خیالات کا ہر ایک شعبہ مذہبی عقائد کے تحت چلتا تھا۔ عوام کے جذبا

کو باقی چیزیں چھوڑ کر صرف مذہبی جذبات کی غذا دی جاتی تھی۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ عوام اپنا مفاد پیش کریں تو اسے بھی مذہبی اعتقادات کی شکل دے کر پیش کریں تاکہ ان میں تیزی سے پھیل جانے کی قوت آجائے۔ چناں چہ تجارت پیشہ دولت مند، باحیثیت طبقہ پوری قوت سے اُبھر رہا تھا اور اس کے ساتھ پروٹسٹنٹ مذہب بھی طاقت ور ہوتا جا رہا تھا۔ اور جب اس طبقے کی قوت خوب مضبوط ہوگئی۔ جاگیردار شرفا اور امرا کے مقابلے میں ان کی زور آزمائی ایک ایک شہر اور بستی سے آگے بڑھ کر پورے پورے ملک میں پھیلنے لگی تو جرمنی میں انھوں نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی زبردست کارروائی کر ڈالی۔ جو "سدھار" کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئی۔ مگر سدھار کا یہ زبردست قدم کامیاب نہیں رہا کیوں کہ اس وقت کے جتنے طبقے جاگیردار امرا اور شرفا کے خلاف غصہ اور بے چینی رکھتے تھے ان کو ایک مرکز پر لایا نہ جا سکا۔ کمزوری رہ گئی جس سے تجارت پیشہ دولت مند طبقے کو آگے چل کر شکست کا سامنا کرنا پڑا اور جو قوت خود بڑھنے اور سماج کو آگے بڑھانے کے لئے زور لگا رہی تھی اس کی بے تنظیمی اور شکست کی وجہ سے سماجی سرگرمی رک گئی اور تین سو برس کے قریب جرمنی میں سناٹا چھایا رہا۔

البتہ وہ لاوا فرانس میں پھوٹا۔ وہاں کالون نے سدھار کے پروگرام کو اس نظریے سے تیار کیا جس سے بورژوا طبقے کا انداز ٹپکتا ہے۔ اس نے کلیسائی نظام (چرچ) کو جمہوری سانچوں میں ڈھال دیا۔ کالون کا پیش کیا ہوا مذہبی اور سماجی اصلاح کا پروگرام یورپ کے ایک ایک ملک میں

جاگیرداری کے خلاف زبردست نعرہ اور جمہوری روح لئے ہوئے پہنچا۔ جنیوا میں، ہالینڈ میں، اسکاٹ لینڈ میں ہر جگہ اس نے مشعل روشن کر دی۔ اور انگلینڈ میں جو بورژوا (سرمایہ دارانہ) انقلاب (کا ڈرامہ) ہو رہا تھا اس کے دوسرے ایکٹ کے لئے نظریاتی لباس تیار کر کے دے دیا۔ اب اگر کالون کی تحریک کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس زمانے کا جو سرمایہ دار طبقہ تھا اس کے مفاد اور مقصد کے لئے یہ تحریک ایک مذہبی جامہ تھی"۔ بعد میں (۱۶۸۹ء) اگرچہ (انگلینڈ میں) اس عہد کے سرمایہ داروں اور جاگیردار امرا میں سمجھوتہ ہو گیا لیکن اس میں ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کا پلہ بھاری رہا۔ پھر سے سرکاری کلیسائی نظام تو قائم رہا لیکن پرانا کیتھولک نظام نہیں بلکہ کالون کے اصول پر بنایا ہوا چرچ۔ جس پر بورژوا طبقے کے مذہبی (اور سماجی) تصور کی چھاپ تھی۔ اور آج تک انگلینڈ میں وہی چرچ چلا آتا ہے۔

فرانس میں کالون مذہب کے حامی اقلیت میں رہ گئے اور کچلے گئے۔ (۱۶۸۵ء) لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی عقائد سے آزاد ہو کر سوچنے والی تحریک چل پڑی۔ اور شہنشاہ لوئی چار دہم[۱۴] نے جو زبردستی کرنی چاہی اس نے فرانس کے سرمایہ دار طبقے کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ مذہبی لبادے کو بالکل اتار کر اور قطعی سیاسی طریقے سے سیاسی جنگ کریں۔ یوں گویا نیا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ اپنے اقتدار کی جنگ میں مذہبی روپ اور اعتقادات کے سہارے سے بالکل بے نیاز ہو گیا۔" اور اس طرح سے عیسائیت اپنی آخری منزل میں داخل ہو گئی۔ وہ اب اس قابل نہیں رہ گئی کہ آئندہ کسی

آگے بڑھنے والے طبقے کے تقاضوں اور اس کی تمناؤں کے لئے نظریاتی جامے کا کام کر سکے۔ وہ اب زیادہ سے زیادہ حاکم طبقوں کی ہی مٹھی میں رہنے لگی۔ اور وہ (حاکم طبقے) اسے اپنے سرکاری ذرائع کے طور پر استعمال کرنے لگے تاکہ جو نیچے کے (دبے ہوئے) طبقے ہیں انھیں (اسی طرح) بندھنوں میں گرفتار رکھا جائے اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی کہ مختلف طبقوں میں سے ہر ایک نے اپنے لئے (عیسائیت کے مختلف مذہبوں میں سے) مناسب حال مذہب اختیار کر لیا ہے۔ جو جاگیردار شرفا اور امرا ہیں انھوں نے کیتھولک مسیحیت کو اپنا لیا یا کٹر اور تنگ نظر پروٹسٹنٹ رجحان کو جو ذرا آزاد خیال اور روشن فکر سرمایہ دار طبقہ ہے اس نے عقلیت پسندی کو۔ یہ اور بات ہے کہ یہ بھلے آدمی اپنے اپنے مذاہب پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں۔"

اینگلز نے مسیحیت کی تاریخی اور سماجی حیثیت کے ابھرے ہوئے نقوش پیش کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب جب ایک بار بن گیا تو پھر اس میں پرانا سروسامان ہمیشہ موجود رہتا ہے ...... لیکن اس سروسامان میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ پیدا ہوتی ہیں (سماج کے اندر) طبقاتی رشتے سے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیئے کہ جو لوگ یہ مذہبی تبدیلیاں کرتے ہیں جو (سماج کے اندر) ان کی معاشی حیثیت ہوتی ہے اس کے مطابق تبدیلی آتی ہے۔"

یہاں مسیحیت کی سماجی تاریخ مختصر طور پر پیش کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا کے دوسرے بڑے مذہبوں کی تاریخ کو اگر کھنگالا جائے تو ان میں بھی ملتے جلتے حالات ملیں گے۔ بدھ مت، جین مت، اسلام، آریہ سماج اور سکھ مذہب ایشیا کے بڑے مذاہب ہیں۔ اگر ان کی سماجی اور مذہبی عقائد کے روپ کو ایک ساتھ جوڑ کر اور ان سے وہم پرستی اور افسانہ تراشی یا ذاتی جذبات و اعتقادات کو الگ رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسیحیت کی اوپر بیان کی ہوئی تاریخ صرف مسیحیت کی تاریخ نہیں ہے بلکہ جو اصول وہاں کام کرتے رہے ہیں یہاں بھی قریب قریب اسی طرح کارفرما رہے ہیں۔ مثلاً یہ واقعات بے سبب اور ناگہانی نہیں ہیں کہ:۔

مہاتما بدھ نے ـــــ جو خود ایک بڑے حکمراں خاندان کے فرد تھے، ذات پات کے خلاف اپنا پرچار اس وقت شروع کیا جب چھوٹے چھوٹے راجوں کی جنگ روزمرہ کا قصہ بن گئی تھی۔ ذات پات کے بندھنوں نے سماج کی ترقی روک لی تھی اور برہمنوں کا اقتدار پورے سماج میں پیداواری طاقتیں روکنے کا اور خون خرابے اور تفرقے کا سبب بن گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے راجوں کو توڑ کر جس طرح ہندوستان میں ایک بڑی سلطنت کی ضرورت تھی جو ذات پات کے بندھنوں سے اور آپس کے خون خرابوں سے اور برہمنوں کے طبقہ وارانہ اقتدار سے پاک ہو، اسی طرح ایک ایسی سلطنت کے لئے ذہنی اور اعتقادی راہ تیار کرنے کے واسطے ویسے ہی لچک دار مذہب کی بھی ضرورت تھی جو سماج کی آگے بڑھنے والی اور بڑھانے والی قوت کے لئے

ایک ہتھیار بن سکے۔ یورپ میں یہ فرض، رومن سلطنت نے اور اس کے جاری کئے ہوئے مذہب نے انجام دیا جس میں دیسی اور بدیسی دیوتاؤں کی ایک جگہ پرستش کی جاتی تھی، ہندوستان میں یہ کام اشوک کے راج نے کیا جس نے طاقت کے زور سے پہلے سلطنت کو وسیع کیا اور پھر بدھ کی تعلیم کو اپنا کر اس کی تبلیغ شروع کردی اور بدھ مذہب اشوک کی سلطنت کے حدود سے باہر تک پھیل گیا۔

مگر جیسے حاکم طبقے نے اپنے زوال کے قریب مسیحیت کو سرکاری مذہب قرار دے دیا اور اس کا طبقاتی مقصد بالکل بدل ڈالا ــ کہ پہلے تو وہ دبے ہوئے غلاموں اور مظلوموں کی صدائے احتجاج تھی اور بعد میں وہی حاکم طبقے کا ہتھیار بن گیا خود انھی مظلوموں اور محکوموں کے خلاف یہی بدھ مت کا حشر ہوا۔ ہندوستان میں تو برہمن اقتدار کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن دوسرے ملکوں میں جہاں بدھ مت نے آگے چل کر قدم جمائے وہاں کے حکمراں طبقوں نے اس کے ابتدائی اصولوں میں اپنی معاشی حیثیت اور ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کرلیں اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ حد یہ ہے کہ جاپان میں بیسویں صدی کے اجارہ دار بورژوا طبقے نے بھی اس کی ضرورت سمجھی کہ بدھ مت کے "Concept - material" (نظریاتی مسالے) کا خول باقی رکھتے ہوئے اس میں اپنی ڈکٹیٹری کی روح ڈال دے۔ چناں چہ شہنشاہ کے متعلق "نائبِ خدا" کے تصوّر نے جاپان کے حکمراں بورژوا طبقے کی سامراجی نیتوں کو مذہبی لباس دے دیا۔

درمیان کے جاگیرداری عہد میں مہاویر نے جو غیر مادّی دیوتاؤں کے وجود سے انکار کیا اسے بھی انھوں نے ایک مذہبی شکل دی۔ بظاہر یہ بات بڑی حیرت ناک

ہے کہ مذہب کے بنیادی عقیدے اور اصل ستون کو اس طرح رد کرنے کے بعد مہاویر نے مذہب کی بنیاد کیوں ڈالی۔ لیکن اس کی پشت پر بھی حقیقت وہی ہے ہر ایک راج، ہر ایک جاتی اور گوتر کے الگ الگ دیوتاؤں کی زمین پر جس طرح انسانوں کی تفریق ہوگئی تھی اور اس تفریق نے سماج کے پاؤں میں جس طرح زنجیریں ڈال رکھی تھیں اس کے توڑ کے لئے مہاویر نے آواز اٹھائی اور انھوں نے برہمنوں کے نامزد کئے ہوئے دیوی دیوتاؤں شیو، وِشنو اور برہما کے متعلق عقائد کی بھول بھلیوں سے نکلنے کے لئے آخری قدم اٹھا دیا۔ اُنھوں نے انسان اور مادّے سے بالاتر ہر ایک خالق قوت سے انکار کر دیا۔ لیکن کیا وہ مادہ پرستی کے فلسفے کی طرف جا رہے تھے؟ نہیں۔ سماجی ترقی کی کئی صدیاں پھلانگ جانا اس وقت کے مادّی حالات اور سماجی رشتوں کو دیکھتے ہوئے بالکل ناممکن تھا اس لئے انھوں نے رائج الوقت مذہبی عقائد اور حاکم طاقتوں کی لائی ہوئی سماجی برتری کے خلاف لڑنے کے لئے خود مذہبی عقائد کا سہارا لیا۔ اور ایک نیا مذہب دے گئے جو اس عہد کے حالات کو دیکھتے ہوئے ترقی کا اگلا قدم تھا۔ اور سماج کے بے چین طبقوں نے اسے "بے درد دُنیا کی دردمندی" سمجھ کر اپنا لیا۔

اسلام دُنیا کے تین بڑے مذاہب میں سب سے تازہ مذہب ہے اور اس کی تاریخی تفصیلات ایک ایک کر کے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اگر ۱۳۷۷ برس پہلے کی عرب سوسائٹی کے حالات کو نظر کے سامنے رکھا جائے جس سے ادب میں ہمیں قبائلی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ، نسلی برتری کے مظاہرے اور سماجی ترقی کی سب سے نیچی سطح ملتی ہے تو معلوم ہوگا کہ سماج کا انتشار ایک لازمی صورتِ حال تھی ایک

ایک قبیلے کا الگ الگ بُتوں پر اعتقاد رکھنا ان سماجی حالات کا یقینی نتیجہ تھا۔ جس میں ایک قبیلے کا دوسرے قبیلے سے کوئی رشتہ تھا تو صرف جنگ کا۔ غلاموں کا قتل اور ان سے حیوانیت کا سلوک۔ اسلام سے پہلے عرب کے معاشی حالات کا اثر تھا کیوں کہ غلاموں سے کوئی اہم معاشی فائدہ نہ تھا اور وہ مفت میں ایک بوجھ بن جاتے تھے۔ عورتوں کو عرب سردار اس لئے قتل کرتے تھے کہ قبیلوں کی زندگی شکار کی تلاش، چراگاہوں کی تلاش، مسلسل سفر اور مسلسل جنگ میں گزرتی تھی جنگ اور غارت گری جہاں قتل کا سبب بنتی تھی وہاں ان کی گزر بسر کا بھی سامان وہی تھا۔ کیوں کہ قبیلے کو سبزہ زار، چراگاہ اور شکار اور مویشیوں کی ضرورت تھی اور وہ صحرائے عرب میں بہت محدود تھے اس لئے حریف سے چھیننے کے لئے جنگ ضروری تھی۔ جنگ کی وجہ سے مردوں کی اہمیت اور ان کی معاشی افادیت بہت زیادہ تھی۔ عورتیں ایسی زندگی میں ایک بوجھ اور بڑی ذمہ داری بن جاتی تھیں (یہاں یہ واضح رہے کہ اسلام سے پہلے کے عرب میں یہی وجہ تھی جو بتوں میں دیویاں نہ تھیں، دیوتا ہوا کرتے تھے)

عربوں کے یہ سماجی حالات اس وقت تک تو باقی رہے جب تک شام، لبنان، ایران، مصر، اٹلی اور ہندستان جیسے ملکوں میں ان کا آنا جانا نہیں ہوا جہاں زراعت پھل پھول رہی تھی اور تجارت کا بازار گرم تھا۔ ان ملکوں میں جاگیرداری سماج قائم ہوئے بھی ایک عرصہ گزر چکا تھا اور باقاعدہ جاگیردارانہ ریاستیں قائم تھیں۔ عربوں نے جہاز رانی کے ذریعے ان ملکوں سے رابطہ پیدا کیا۔ معمولی قسم کی تجارت کی اور دیکھا کہ خود ان کے یہاں کی قبائلی زندگی

بہت پستی کے عالم میں ہے اور انسانیت کی نئی سطح سے بہت پیچھے ہے۔ یہ خیال پھیلنے لگا تھا جب اسلام نمودار ہوا۔ اسلام نے سماج کو ان حالات سے اوپر اٹھانا چاہا تو اس کا نصب العین وہ سماج تھا جس میں عورتوں کی یہ حیثیت آپ سے آپ ختم ہو جاتی تھی۔ انھیں زندگی ملنے والی تھی اور قبیلے کی زندگی میں اہم مقام ملنے والا تھا۔ غلاموں کے قتل کی جگہ انھیں پیداوار اور محنت کے کاموں میں برابر کا شریک کیا جانے والا تھا اس طرح سے سماج کی دو کچلی ہوئی مظلوم طاقتوں کو سماج کی متحرک اور افادی قوت بنا کر اور نسلی برتری اور قبائلی اونچ نیچ کا تصور مٹا کر ایک متحد اور ہم آہنگ سماج کی طرف بڑھنا تھا تاکہ تجارت اور زراعت کی طرف توجہ بڑھے اور اس پر کوئی روک ٹوک نہ ہو۔ بستیاں بسیں، شہر اور قصبات آباد ہوں۔ سماج کا انتشار دور ہو اور اسے ایک سلطنت اور ایک مرکز پر لایا جائے۔ ان میں بھائی چارہ قائم کیا جائے اور ان میں یگانگت اور سوشل زندگی کی نئی روح پھونکی جائے۔ چناں چہ اسلام نے تمام قبائل کے مذہبی مرکز کعبے سے ۳۶۰ بتوں کا افتراق نکال کر پھینک دیا اور اس کی جگہ ایک خدا (لا الٰہ الا اللّٰہ) کا تصور پیش کیا جو متعدد خداؤں کے مذہبی عقیدے اور متعدد قبیلوں کے سماجی نظام سے آگے بڑھنے کا ایک قدم تھا

> "ترقی کی اگلی منزل پر پہنچ کر فطرت اور سماج سے وابستہ جو بے شمار خداؤں کا سلسلہ ہوتا ہے وہ ایک قادرِ مطلق خدا میں بدل جاتا ہے۔"
>
> (اینگلز)

سماج کی نئی قوتوں کی ابھار، سماج کی نئے سرے سے تنظیم اور اس کے

مظاہرے یعنی اسلام کے مذہبی عقیدے نے عربوں کو پچاس برس میں اس منزل پر پہنچا دیا جس کا خلاصہ فردوسی کے اس طنز میں موجود ہے ؎

زشیرِ شتر خوردن و سُوسمار عرب را بہ جائے رسیدست کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو

(جو عرب لوگ کل تک اونٹنی کا دودھ پیتے تھے اور گوہ جیسے جانور کا گوشت کھاکر پیٹ بھرتے تھے آج ان کی یہ مجال ہونے لگی کہ وہ ایران کے شاہی تخت پر نظر رکھتے ہیں اور اس کی آرزو کرتے ہیں)

جب ان کی یہ آرزو پوری ہوگئی۔ عرب نے ایران و ترکی، شام و عراق اور یمن کو فتح کرلیا اور عرب کے نئے سماج میں طبقات کی حیثیت بدلی، اور جاگیرداری سماج کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا تو حاکم طبقے نے اسی مذہب کو محکوموں کے دبائے رکھنے اور مخالف طبقوں کے کچلنے کے لئے استعمال بھی کیا۔

ایک زمانے تک نیا مذہبی عقیدہ اور نیا سماجی نظام جب اپنی برکتیں برسا چکا اور اس کا ارتقائی پہلو دب گیا تو اسی سماج کے اندر سے ایسے فرقوں اور گروہوں اور طبقوں نے اُبھرنا شروع کیا جنھیں حاکم طبقے نے بے دردی سے کچلا تھا۔ ایران میں حسن بن صباح کی چھاپہ مار تحریک، معتزلہ کی نیم فلسفیانہ نیم مذہبی تحریک اور آگے چل کر مصر میں فاطمیوں کا اُبھرنا، اور شیعی تحریک کا طاقت ور ہونا ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں جن کے پیچھے راز یہ تھا کہ عرب جاگیرداری کے پنجے اور اس کے جبروت سے نجات حاصل کی جائے اور ان تمام تحریکوں نے بھی اسلام کا (Concept Material) نظریاتی سامان

لے کر اس میں اپنے سماجی مقاصد کے مطابق نیا رُخ دیا۔ ایران میں عرب اقتدار سے جو قومی تذلیل کا جذبہ اندر اندر پک رہا تھا۔ اس کا اظہار تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے معتزلہ عقائد کی شکل میں اور کسانوں، چھوٹے زمینداروں اور دستکاروں کے اندر باطنیہ عقائد کی شکل میں ہوا اور سماج کے اندر کی دوسری دبی ہوئی طاقتیں مذہب ہی کا لباس ہی اوڑھ کر نکلیں۔

یہ ہے کارل مارکس کے اس قول کی مختصر تشریح کہ "مذہب کے روپ میں جو دکھ اور کراہ ہے اس کے دو رُخ ہیں۔" ایک جبر و مصائب کا اظہار۔ دوسرے ان مصائب کے خلاف احتجاج اور اس طرح سے انسانی سماج کے اُبھرنے والے طبقوں نے اپنے نئے تقاضوں کی پذیرائی کے لئے مذہب کے قدیم جامے کو بھی استعمال کیا ہے۔ اور اینگلز نے تسلیم کیا ہے کہ:۔

"دنیا کے تین بڑے مذہب جو آج تک چلے آ رہے ہیں، بدھ مت، مسیحیت اور اسلام، جہاں تک ان مذہبوں کا تعلق ہے دنیا کے خاص تاریخی موڑ ان مذہبی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ آئے ہیں ....."

لیکن اس موقع پر اینگلز نے یہ نکتہ بھی جتا دیا ہے کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ عالم انسانیت کے مختلف دَور صرف مذہبی تبدیلیوں کے ذریعے

ہی پہچانے جاتے ہیں اور نہ اس کا یہ مفہوم ہے کہ مذہبی عقائد اور شریعت یا فقہ پورے سماج میں تبدیلی۔ تنزل یا ترقی کے تقاضوں کو ہی ظاہر کرتی ہے[1]

آخر یہ کیوں ہوتا رہا ہے کہ سماج میں تبدیلی ہوتی رہی۔ نئے طبقوں کا ظہور ہوتا رہا۔ تاریخ موڑ لیتی رہی۔ نئی پیداواری طاقتیں دریافت کی جاتی رہیں اور سائنس کے قدم آگے بڑھتے رہے لیکن آدمی کی لاعلمی اور ان جانی نامحسوس طاقتوں پر اس کا اعتقاد برابر کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرتا رہا۔ اس کا جواب کمیونزم کا فلسفہ پھر اسی سماجی تاریخ میں تلاش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آدمی اپنے زمانے کے حالات کی حدوں میں سوچتا ہے اور وہ اس سے بالکل بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

"ماضی کے تمام سماج کی تاریخ یہ ہے کہ طبقاتی ٹکراؤ کس کس صورت میں بڑھتا رہا ہے۔ وہ ٹکراؤ جس نے مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ چاہے اس نے کوئی شکل بھی اختیار کی ہو۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جو تمام گزرے ہوئے دوروں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ سماج کے ایک حصے کو دوسرے حصے نے دبایا اور اپنا شکار بنایا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے

---

[1] یہاں یہ نکتہ واضح رہنا چاہیے کہ مذہبی عقائد کے اندر کی اور اس سے باہر کی کش مکش میں آئڈل ازم اور میٹیریل ازم کی پیکار ہمیشہ ہر زمانے میں ایک نہ ایک سطح پر جاری رہی ہے لیکن حاوی با اقتدار طبقہ عام طور سے مادی فکر اور استدلال کے نظریوں کو دبا تا کچلتا رہا کیونکہ وہ اس کے خلاف جاتا تھا۔

کہ پچھلے زمانوں میں جو سماجی شعور تھا، جو سوشل سوجھ بوجھ تھی، حالانکہ اس سے رنگا رنگی ٹپکتی ہے اور وہ مختلف شعبوں میں ظاہر ہوتی ہے تاہم وہ کچھ ایک جیسی شکلوں میں اور عام خیالات (کی حدوں) میں ہی حرکت کرتی ہے۔ وہ حدیں اس وقت تک پوری طرح ختم نہیں ہو سکتی تھیں جب تک طبقاتی ٹکراؤ اور طبقاتی صف بندی پوری طرح ختم نہ ہو جائے۔" (کمیونسٹ مینی فسٹو۔ از۔ مارکس و اینگلز)

اس قول کی صداقت کا اور گہرا مطالعہ کرنا ہو تو ہر مذہب کے عقائد اور اصولوں کو رائج الوقت عقائد اور اصولوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ بدھ مت اور جین ازم دونوں نے ویدوں اور پرانوں کے تقدس سے انکار کیا، ان میں بتائے ہوئے اصولوں سے انکار کیا۔ ان کی علمی ہیئت سے انکار کیا۔ بدھ مت نے عقائد اور اعمال کے لئے اپنے آٹھ اصول اور جین ازم نے اپنے طور پر تین اصول وضع کئے۔ لیکن بالآخر ان دونوں مذاہب نے ویدوں اور پرانوں کے تاریخی افسانے اور ان کی دیومالا سے رشتہ جوڑ لیا۔ رائج الوقت دیوی دیوتاؤں کی روایات بدلے ہوئے روپ کے ساتھ اور کمی بیشی کے ساتھ ان دونوں مذاہب میں بھی دخل انداز ہو گئیں۔

مسیحیت نے یہود کی افسانہ تراشیوں کو ٹھکرا دیا اور ان کے بتائے ہوئے عقیدوں سے انکار کیا لیکن خود مسیحیت کے لٹریچر میں جو آج ہم تک پہنچا ہے، توریت اور زبور کی تقدیس کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ ان کی روایات بھی موجود ہیں اور ان کی ترمیم شدہ صورتیں بھی محفوظ کر دی گئی ہیں۔

اسلام نے یہود و نصاریٰ کی اعتقادی تعمیر اور ان کے اقتدار کے علم جہاد بلند کیا اور انھیں منسوخ کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن توریت و زبور اور انجیل کے خاص خاص افسانے اور روایات اور اعتقاد کی اصل بنیادیں یہاں بھی باقی ہیں۔ اور رائج الوقت مذاہب کی اصلی روح کو برقرار رکھا گیا ہے۔ مسیح کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "اعطنی الکتابُ وجعلنی نبیاً" سماج اپنی پیداواری حالت اور سوجھ بوجھ کے متعلق اس منزل میں نہیں تھا کہ اس کا اگلا قدم پچھلے تمام نشانات سے اپنا رشتہ بالکل توڑ لیتا۔ یہ ممکن نہیں تھا اور جو ہوا وہ بالکل قدرتی بات تھی۔ سماجی پس منظر میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقاتی سماج کے اس دور میں یہ بالکل حقیقی صورت حال تھی۔ مذاہب پیش کرنے والوں کا مقصد اس سے دھوکا دینا ہرگز نہیں تھا۔

> "(تاریخی لحاظ سے اور سماجی اعتبار سے) خدا کا تصور اِن خیالات کا مرکب ہے جو انسان کی لاعلمی اور اس کے دبے ہوئے ہونے کی بدولت پیدا ہوئے۔ اول تو وہ فطرت کی طاقتوں کے آگے بے بس تھا اور بعد میں وہ طبقاتی جبر کے نیچے دب گیا۔ یہ اعتقادات وہ ہیں جو آدمی کی اس بے خبری کو ہمیشہ باقی رکھتے ہیں اور اس کی طبقاتی جد وجہد کی دھار کند کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔"

(لینن۔ گورکی کے نام خط)

لیکن طبقاتی جد وجہد کی دھار کند کرنے کا کام مذہب سے اکثر حکمراں طبقوں نے لیا ہے اور اسی معنوں میں مارکس نے مذہب کو "لوگوں کے لئے افیم" کہا ہے۔

یہ بات بے سبب نہیں ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب میں۔ جب وہ ایک بار مسلط ہو چکے تو ـــــ اس تعلیم پر زور دیا گیا جو صبر و رضا، قناعت' دوسری دنیا میں صلہ ملنے کا یقین، بردباری، درگزر مشیت ایزدی، تپسیا (ریاضت) اور ایثار کو اہمیت دیتی ہے اور یہ تعلیم ایسی ہے کہ ہر مذہب اور شریعت میں اسے ستونوں کی حیثیت دی گئی ہے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مظلوم' محکوم اور دبے ہوئے طبقوں، گروہوں اور جماعتوں کے جذبۂ بغاوت کو اس تعلیم کی غذا دینا کیا معنی رکھتا ہے اور اس سے کس طبقے کا مفاد پورا ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ انسان کی سماجی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والی سائنس مارکس ازم یہ بھی جانتی ہے کہ :-

> "تاریخ میں ایسا وقت بھی آیا ہے جب . . . . جمہوری اور پرولتاری جدوجہد نے مذہبی شکل اختیار کی اور وہ ایک مذہبی عقیدے کی دوسرے مذہبی عقیدے کے خلاف جنگ کے روپ میں ظاہر ہوئی"
>
> (لینن۔ گورکی کے نام خط)

سماجی تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلی صدی کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ وقت گزر گیا جب طبقاتی مفاد مذہبی پوشاک میں اپنا کام کرنے پر مجبور تھا۔ (قرونِ وسطیٰ یا) درمیانی عہد کی کئی صدیوں میں اور ہر سرزمین پر مذہبی اعتقاد کی اہمیت طبقاتی ٹکراؤ سے وابستہ رہی۔ جب سائنس نے کائنات کے نئے سرچشمے دریافت کئے اور پیداواری قوتوں کا خزانہ کھل گیا۔ مغربی یورپ، خاص کر انگلینڈ میں جاگیرداری اور دستکاری کے شکم سے سرمایہ داری کی قوت کا

پہلا وجود ہوا۔ جس طرح غلامی کا سسٹم ٹوٹ کر اس کی جگہ رعایا کسان رکھنے کا سسٹم پھیلا تھا، اسی طرح اب رعایا سسٹم بھی ٹوٹ چکا تھا اور اس کی جگہ مزدوری پر کام کرنے والے کسان (کھیت مزدور) طبقے کی تعداد بڑھتی جارہی تھی نئے نئے سرمایہ دار سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں بڑی بڑی زمینیں خرید کر وہاں اون اور کپاس بونے اور ایسی فصلیں تیار کرانے لگے تھے جنھیں غیر ملکی تجارت اور ملکی کارخانوں کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ سرمایہ داروں کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ صنعتی انقلاب کے آثار پیدا ہو رہے تھے کہ ہنری ہشتم نے رومن چرچ کی ماتحتی سے رشتہ توڑ دیا۔ کلیسائی جاگیریں ضبط کرلیں اور پورا نظام برخاست کر دیا۔ یہ (ٹوڈر خاندان کی حکومت کا) وہ عہد تھا جب بورژوا طبقے نے آگے بڑھنے کے لئے، مزدوروں کو زمین کی قید سے چھڑانے، سستا مزدور حاصل کرنے اور سماجی وسیاسی اقتدار میں حصہ دار بننے کے لئے بڑے جاگیرداروں سے معاملہ کر لیا تھا۔ لیکن یہ معاملہ فہمی بہت دن تک چلنے والی نہیں تھی۔ کچھ عرصہ بعد چارلس اول کے زمانے میں بھاری ٹیکسوں کے سوال پر اختلاف بڑھا اور خانہ جنگی ہوئی۔ ایک طرف بورژوا طبقہ تھا اور اس کی پشت پر کسان تھے، دستکار تھے، شہر کے معمولی کاروباری اور محنت پیشہ لوگ تھے اور دوسری طرف سب سے بڑا جاگیردار شاہی خاندان، اس کی طرف سے نامزد کئے ہوئے پادری اور بڑے بڑے جاگیردار شرفا اور امرا۔ یہ انگلینڈ میں آخری جنگ تھی جس میں مذہب کا پرچم استعمال کیا گیا اور سائنس کی ابھاری ہوئی نئی طاقت نے اعتقاد کا بھی سہارا لیا۔ شاہ چارلس اول کے ساتھ اگر منظم کلیسا تھا تو کرامویل (برطانوی

بورژوا طبقے کے ہیرو) کی جانب کئی مذہبی فرقے تھے جو مذہبی عبادات میں زیادہ آزاد رائے رکھتے تھے۔ لیکن بورژوا طبقہ تنہا وجود میں نہیں آتا۔ وہ اپنے ساتھ صنعتی مزدور طبقہ اور پڑھا لکھا درمیانی طبقہ بھی لاتا ہے۔ انھی میں "ڈگرس" کی جماعت تھی۔ جو لڑائی میں شریک تھے مگر مذہبی جذبات و اعتقادات سے بے تعلق ہو کر ڈگرس کے لیڈر نے کھلے لفظوں سے سماجی جنگ میں مذہبی عقیدوں کو لانے کی مخالفت کی اور کہا کہ مذہب کو اس لئے بیچ میں لایا جاتا ہے کہ غریبوں کو ان کی غربت پر رضامند کر دیا جائے اور انھیں سمجھایا جائے کہ خدا کی مشیت یہی ہے اس میں کسی کا کیا دخل۔ آدمی سے کہا جاتا ہے کہ وہ عاقبت پر نظر رکھے۔ موت کے بعد جنت کی تمنا کرتا ہے اور جہنم کے خوف سے کانپتا رہے آدمی کی نظریں ادھر رہتی ہیں اور وہ یہ نہیں دیکھ پاتا کہ اسے بے خبر کر کے موجودہ زندگی کے کیا کیا پیدائشی حقوق اس سے چھین لئے گئے۔

اسی طرح سے صنعتی انقلاب انگلینڈ میں جن طبقوں کو سامنے لایا ان میں سے بورژوا طبقے نے مذہبی پوشاک کو اپنا لیا۔ اور محنت کشوں نے اسے اس کی جگہ چھوڑ دیا۔ اور وہ سماج میں اپنی طبقاتی حیثیت اور طبقاتی کش مکش کو بے پردہ دیکھنے لگے۔ (واضح رہے کہ یہ واقعہ مارکس اور اینگلز کی پہلی تصنیف شائع ہونے سے دو صدی پہلے کا ہے)

اٹھارویں صدی میں جب فرانس میں بورژوا طبقے نے اقتدار کی طبقاتی کش مکش شروع کی تو اس نے مذہب کو بالکل نہیں چھوا۔ انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) کو مذہبی پرچم اٹھانے یا نئی پیداواری قوتوں کی فتح یا ان کے مفاد

کے لئے نئے یا پرانے مذہبی عقائد سے کام لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ رابس پیر نے چاہا تھا کہ وہ اس موڑ پر ایک نئے مذہب کو وجود میں لائے۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

جرمنی میں اس دور سے پہلے ہی کسانوں کی بغاوت نے اگرچہ وہ مذہبی عقائد کے ساتھ وابستہ رہی لیکن اس بات کے لئے زمین ہموار کر دی تھی کہ بورژوا طبقہ اُبھرے اور جاگیرداری کا تختہ الٹ دے۔ اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جب جرمنی میں بورژوا طبقہ با اقتدار ہوا تو اسے بھی مذہبی عقائد کے نقاب کی ضرورت نہیں رہی تھی کیوں کہ جاگیرداری کے خلاف جرمن عوام کا جذبہ اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنے سیاسی و سماجی حقوق کی راہ میں جہاں جاگیرداری کو سب سے بڑا دشمن سمجھ رہے تھے وہاں انھوں نے مسلسل تجربوں سے یہ بھی جان لیا تھا کہ جاگیرداری نظام کی پشت پر کلیسا تو تھا ہی لیکن کسانوں کی بغاوت کو اُبھرتے دیکھ کر لوتھر جیسے مذہبی رہنما نے بھی اسی کا ساتھ دیا۔

اس طرح (یورپ اور امریکہ میں خاص طور سے) جہاں جہاں صنعتی سماج پھیلتا گیا بورژوا طبقے کے ہاتھ میں اقتدار آتا گیا سائنس کی نئی دریافتوں کے خزانے کھلتے گئے۔ مذہبی اعتقادات کا سلسلۂ دراز بھی سکڑتا سمٹتا چلا گیا اور ہزاروں برس تک مسلسل ایک دوسرے سے ہم آغوش رہنے کے بعد سائنس اور اعتقاد نے پرانا ناتہ توڑ لیا۔ بورژوا طبقے نے سائنس کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی حقیقی طاقتوں کا دامن پکڑ لیا۔ اور نا محسوس طاقتوں پر اعتقاد اور مذہبی کاروبار کو پیشہ ور مذہبی اداروں کے حوالے کر دیا اور ان کا اقتدار بہت

محدود کر دیا کیوں کہ سرمایہ داری طاقتیں بڑے زور شور سے نئی پیداواری قوتوں کے ساتھ اٹھتی تھیں اور ساری کائنات کو فتح کرتی ہوئی چلی جارہی تھیں ترقی یافتہ سائنس نے جو فطرت کی طاقتوں کو زیر کیا اس نے بورژوا طبقے کو اپنی قوت اور اپنی دریافتوں پر اعتماد کرنا سکھا دیا۔ اور فطرت کی ان جانی طاقتوں سے ڈرنے کی عادت دُور کر دی۔

(یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخری نصف اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کے اس ادب میں جو صنعتی ملکوں میں پیدا ہوا مذہب اور اس کے اعتقادات کا بڑا مذاق اڑایا گیا ہے)

مگر یہ صورتِ حال کب تک رہی۔ ترقی کی رفتار بھی تیز تھی اور طبقات کی تقسیم اور ان کا ٹکراؤ تیز تر۔ بہت جلد وہ منزل آگئی جب سرمایہ داری عہد کا طبقاتی سماج خود اپنے بُنے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ بڑے پیمانے کی صنعتیں اور ان کے ساتھ اجارے پھیلے۔ دنیا بھر کی نوآبادیات ختم ہوگئیں۔ ایک طرف پیداواری طاقتیں بڑھتی چلی گئیں۔ دوسری طرف سرمایہ داری کی لوٹ بڑھتی گئی۔ اور سماج کی ایک بہت بڑی آبادی کی قوت خرید کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ سرمایہ داری کی خوش حالی کا زمانہ ختم ہونے لگا اور ۱۸۲۵ء میں پہلی بار صنعتی سرمایہ داری کے نظام کو بحران (کرائسس) کا جھٹکا لگا۔
زمینوں، کارخانوں اور فیکٹریوں نے جتنا مال پیدا کیا وہ کھپ نہیں سکا۔

جس سے کاروبار پر ضرب پڑی۔ لگے ہوئے سرمائے میں گھاٹا آیا۔ بینک فیل ہونے کی نوبت آگئی اور وہی سرمایہ دارانہ نظام جو نئی نئی کاروباری سرگرمیوں کے دروازے کھول چکا تھا۔ اسی نے اب بے روزگاری کو جنم دیا۔ حالات غیر یقینی نظر آنے لگے اور اب طبقہ وارانہ سماج کی اپنی ہاتھوں سے بنائی ہوئی طاقت بھی ویسی ہی بے محابا اور بے درد نظر آنے لگی۔ جیسے ابتدائی انسان کو فطرت کی طاقتیں نظر آتی تھیں۔

بورژوا طبقے نے پیداواری طاقتوں کو بہ یک لگانا شروع کردیا۔ اس نے سماج میں جو انقلاب برپا کیا تھا اور جو عام لوگوں کو حقوق بخشے تھے ان پر پہرے بٹھائے جانے لگے۔ اور مزدوروں کو انقلابی خیالات کا ادب پڑھنے سے روکا جانے لگا۔ ادھر صنعتی مزدوروں میں ایک ساتھ کام کرتے کرتے اور تنظیم کی طاقت کا تجربہ دیکھ کر سیاسی قوت حاصل کرنے کی مہم تیز ہونے لگی تھی۔ انگلینڈ میں چارٹسٹ تحریک چلی۔ فرانس اور جرمنی اور بعض دوسرے ملکوں کے صنعتی مزدوروں نے اپنی لیگیں قائم کرلیں اور مالکوں کے مقابلے میں متحد ہو کر صف آرا ہونے لگے۔ امریکہ میں صنعتی مزدوروں نے زبردست ہڑتالیں کیں۔ کام کے اوقات مقرر کرنے اور سیاسی اور معاشی حقوق جیتنے کے لئے صنعتی سرمایہ داری کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہڑتالیں روزمرہ کی بات بن گئیں۔ اور بورژوا طبقہ خود اپنے سب سے اہم تضاد میں بُری طرح گرفتار ہوگیا۔

یہ کٹھن وقت تھا جب ایک بار پھر بورژوا طبقے نے پیچھے مڑکر کلیسا کی طرف دیکھا اُدھر کلیسائی نظام اور اس کے سب سے بڑے قلعے کیتھولک دین

چرچ کو بھی خطرے کا احساس تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اقتدار کا پرانا حلقہ ـــــ غریب، ان پڑھ، نیم جاہل، محنت کش عوام اس کے ہاتھوں سے نکلتے جا رہے ہیں اور روز بہ روز باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ منظم مذہب سے بے نیاز بلکہ بے زار ہوتے جا رہے ہیں۔ کلیسا نے بورژوا طبقے کے تیوروں سے بھانپ لیا کہ وہ بے بسی محسوس کر رہا ہے اور اس کی امداد کا ضرورت مند ہے۔ چناں چہ وقت پڑا تو ڈیڑھ سو برس کی پرانی دشمنی پر خاک ڈال کر دونوں نے ایک دوسرے کو پھر گلے لگا لیا۔

بورژوا طبقہ ہوشیار تھا اس نے دُنیا کے جس حصے میں بھی منظم مذہب کے لیڈروں سے سمجھوتہ کیا اس بات کا خیال رکھا کہ مذہبی عقائد کی کوئی بندش اس کے اپنے طبقاتی مفاد کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ لیکن مذہبی عقائد اور منظم مذہب کی ساری قوت کو اپنے طبقاتی مخالفوں کے خلاف استعمال کیا جائے اور اس سودے میں بورژوا طبقے نے منظم مذہب کو کچھ رعائتیں بھی دیں۔ ان میں بڑا حصہ رومن کیتھولک چرچ اور پوپ کے ہاتھ آیا۔ کیوں کہ دُنیا کے تمام منظم مذہبوں میں ان کی قوت سب سے بڑی تھی۔ خاص طور سے برطانوی اور فرانسیسی محکوم ملکوں اور نوآبادیوں کے پچھڑے ہوئے لوگوں میں رومن مسیحیت کے مبلّغ فاتحانہ توپوں کے پیچھے پیچھے انجیل کھولے ہوئے پہنچ چکے تھے۔

اس کے بعد سے اب تک تقریباً سَو برس کے دوران کی تاریخ کے صفحے ہمارے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب سرمایہ دار طبقہ سماج کو آگے بڑھنے سے روک رہا ہے۔ نئی دریافتوں کو تعمیری مقاصد میں لگانے سے انکار کر رہا ہے۔ نئی پیداواری قوتوں کے پھلنے پھولنے میں حائل ہو رہا ہے سماج کو

خوش حالی کے بجائے بدحالی، صحت کے بجائے امراض، اخلاق حسنہ کے بجائے جرائم، روزگار کے بجائے بے روزگاری اور امن کے بجائے جنگ دے رہا ہے۔ سماج کی ترقی کو عوام کے بڑھتے ہوئے شعور کو اپنی موت اور سرمایہ داری کی موت سمجھ رہا ہے اس وقت مذہبی تنظیموں اور عقیدوں کے بڑے بڑے اجارہ دار خاص طور سے کیتھولک کلیسائی نظام برابر اسی زوال پذیر حاکم طبقے کی حمایت اور مزدور تحریک کی مخالفت کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو تمام سرمایہ دار حکومتوں میں حاکم طبقوں سے وابستہ کر لیا ہے ان کے کارناموں پر ایک غیر کمیونسٹ مورخ جوزف میکب نے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے

> "..... خاص طور سے جب روحانی رفیق وہ چرچ ہو جس کا نامۂ اعمال ہزار برس سے بھی زیادہ عرصے سے سیاہ ہو۔ وہ چرچ جو اس بات پر ضد کرے کہ اس کی قوت حکومت (اسٹیٹ) کے لئے ایسی ہے جیسے سورج کی قوت چاند کے لئے۔ وہ چرچ جو خود ہمارے زمانے میں درندگی کی حمایت کر رہا ہے، ہنگریا کی غارت گری سے اور اسپین کی بربادی سے لے کر اس وقت تک، جب کہ جنگ (عظیم) کا رخ فاشسٹوں کے خلاف پھر گیا۔ وہ چرچ جو آج بھی امریکہ پر زور دے کر کہتا ہے کہ وہ نئی جنگ (عظیم) چھیڑ دے۔ حالاں کہ چرچ خوب جانتا ہے کہ اگر جنگ چھڑی تو صرف غیر معمولی ساخت کے ایٹم بم ہی استعمال نہیں ہوں گے بلکہ زہر چھڑکا جائے گا۔ زہریلی گیسیں استعمال کی جائیں گی جس سے صرف ایک ہوائی بیڑہ بارہ گھنٹے کے اندر زمین کے اتنے بڑے حصے سے زندگی کے

تمام آثار ملیا میٹ کر دے گا جتنا بڑا برطانیہ ہے۔ وہ چرچ جو اپنے اصلی مقصد کو چھپاتا ہے اور ظاہر یہ کرتا ہے کہ اسے سماج کی بھلائی اور ترقی سب سے زیادہ عزیز اور مقدم ہے۔

اس (چرچ) نے اپنی قیمت بھی مانگنی شروع کر دی ہے جیسے اس وقت قیمت مانگی تھی جب اٹلی کے عوام کی ان آزادیوں کو مسولینی کے ہاتھ بیچا تھا جو انھوں نے خون دے کر حاصل کی تھیں۔ یا اسپین کے عوام کی قربانیوں سے جیتی ہوئی آزادی کو (فوجی جنرل) فرانکو کے ہاتھ بیچا تھا۔ حال میں یہ ہوا کہ چرچ نے آسٹریلیا میں لیبر حکومت کو سمجھایا کہ جو لوگ چرچ پر تنقید کرتے ہیں انہیں اسی قانون کے تحت سزا دی جائے جو قانون فحاشی کے خلاف مقرر ہے۔ امریکہ میں چرچ نے واشنگٹن (کی حکومت) کو اس کی ترغیب دی کہ تنقید کرنے والوں کو کچلنے کے لئے فیڈرل پولیس بھیجی جائے اور اب وہ اپنے معتقدوں کی اتنی بڑی تعداد کو اس کے لئے تیار کر رہا ہے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ کیتھولک تعلیم پھیلانے کے لئے قوم کے فنڈ سے (جس میں نوّے فی صدی کیتھولک نہیں ہیں) پورا خرچ دیا جائے لیکن اس نے جرائم سے، تکڑموں سے، دھاندلی سے جو سمجھوتہ کیا ہے، اس نے سماجی ظلم اور ناانصافی کے سر پر جو شفقت کا ہاتھ پھیرا ہے (اسپین، پرتگال، برازیل) اور اس نے ساری دنیا میں پچھلے پچیس سال کے اندر جو "نفرت کا راگ" چھیڑا ہے، وہ خود اس کے اعمال کی ترجمانی کرنے کو کافی ہے"۔

میکب نے اپنی کتاب "پے پسی ان پولٹکس" میں واقعات کے پورے ثبوت

کے ساتھ بتایا ہے کہ اٹلی اسپین، پرتگال، جرمنی، جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، چیکوسلاویکیہ فرانس، پولینڈ، چین، جاپان، روس اور بحر الکاہل کے ملکوں میں رومن کیتھولک نظام نے دوسرے مذہبی اداروں کے ایک حصّے کو اپنی لپیٹ میں لے کر کس طرح سرمایہ داروں، جاگیرداروں، سامراجی طاقتوں اور فاشسٹوں اور نازیوں کے مقصد کی خاطر استعمال کیا ہے۔

آج ہم پھر دیکھ رہے ہیں کہ سماجی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے لیکن ذرا آگے بڑھ کر اور دوسری شکل میں۔ صنعتی ملکوں میں سرمایہ دار اور اجارہ دار اور جنگ باز طبقے اور زراعتی ملکوں میں جاگیردار، نیم سرمایہ دار اور فوجی حکمراں گروہ سماج کی نئی پیداواری اور شعوری طاقتوں سے بوکھلائے ہوئے ہیں۔ اور ان غیر یقینی حالات میں، سرمایہ داری سماج کے بے محابا خلفشار کے عالم میں مذہبی اداروں کا بڑا حصّہ ان کے ساتھ ہے۔ لیکن دوسرا رُخ یہ ہے کہ محنت کش اور منظم مزدور طبقہ اور باشعور درمیانی طبقہ سماج کی ان بے درد طاقتوں کے مقابلے میں اپنی آزادی جیتنے کے لئے اُٹھا ہے تو وہ اپنے پیش رو محنت کشوں اور محکوم طبقوں کی طرح اس بات پر مجبور نہیں ہے کہ اپنی آزادی کی تحریک کو سیاسی اقتدار سنبھالنے اور اس کے ذریعے سماجی خوش حالی حاصل کرنے کی لڑائی کو مذہبی جامہ پہنائے اور یہ طبقاتی لڑائی مذہبی جنگ کے روپ میں لڑی جائے۔ سائنس تاریخ اور تجربہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے رازوں کو فاش کر دیا ہے۔ وہ اب انسانیت کی آزادی کی جنگ صرف انسانیت کے ہی نام پہ فتح کرنا چاہتا ہے۔

کمیونسٹ اور اخلاقیات

(یہاں اخلاقیات کا لفظ Ethical Ideologies کے علاوہ Morality اور Social behaviour کے مفہوم پر بھی حاوی ہے)

زندگی کے ہر ایک نظام میں ہمیں اخلاقی نظریوں کا اور اخلاقی برتاؤ کا ایک ڈھانچہ ملتا ہے۔ جب سے انسانی سماج کا وجود ہوا ہے اسی وقت سے اخلاقی اصول بھی قائم ہیں۔ سماج کے اندرونی رشتے بدلنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی اصولوں اور نظریوں میں بھی تبدیلی آتی گئی ہے۔ کبھی یہ تبدیلی نامحسوس طریقے سے ہوئی ہے اور کبھی شدت کے ساتھ۔ کبھی زوردار جھٹکوں کے ساتھ۔ مگر جہاں تک اخلاقیات کی جڑ بنیاد کا تعلق ہے، طبقہ واری سماج کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک اس میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔

کمیونزم کا نظریہ بھی ایک سماجی نظام پیش کرتا ہے اور اب تک دنیا جتنے سماجی نظاموں سے گزر چکی ہے ان سب سے اعلا نظام اور بہتر

ترقی یافتہ سماج پیش کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے پاس ایک اعلا اخلاقی نظریہ بھی ہے۔ وہ اخلاق کی بنیاد ایسے اصول کو قرار دیتا ہے جو اصول انسانوں کے طبقہ وارانہ بٹوارے کو ختم کرنے والا ہے۔

جو بے نظر اور بے تہہ لوگ کمیونزم کی تحریک کو محض اتنا سمجھتے ہیں کہ وہ تخریب یا بغاوت کی تحریک ہے۔ ان کے خیال میں کمیونسٹوں کا کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے۔ سوسائٹی کو باضابطہ رکھنے اور امن امان کے ساتھ چلانے کے لئے انسان نے اخلاقی اصول بنائے ہیں۔ کمیونسٹوں نے چوں کہ سوسائٹی کے پرانے ڈھچر کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا ہے اس لئے انھوں نے اخلاقی بندشوں کو بھی بے معنی سمجھ لیا ہے۔ وہ کسی اخلاقی اصول، کسی اخلاقی ضابطے اور اخلاقی برتاؤ کو نہیں مانتے۔ پرانے بدبودار اخلاقی نظام کے ان ٹھیکہ داروں نے اپنے طور پر اس سے ہر قسم کا نتیجہ نکال لیا ہے اور حیوانیت و درندگی کی جتنی حرکتیں آج تک مختلف اخلاقی نظاموں کے زمانے میں سرزد ہو چکی ہیں ان سب کو جوڑ کر کمیونسٹوں کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ تحقیق اور سچائی کے ان دشمنوں نے لینن کے بعض جملوں کو اپنے مقصد کے لئے توڑ موڑ کر استعمال کیا ہے۔ ان کے خیال میں اس طرح سے عوام کو فریب دینا بھی اخلاقی برتری ہے۔

زیادہ تر لینن کے جن جملوں کو لینن ازم کے ناسمجھ دشمنوں نے اس ذلیل مقصد کے لئے استعمال کیا ہے وہ جملے ایک پوری عبارت کا حصہ ہیں۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پورے سوویت یونین کے نوجوان کمیونسٹوں کی

لیگ کے سامنے لینن نے ایک تقریر کی تھی۔ تقریر میں اس نے کمیونسٹ سماج کے آنے والے معماروں کی نئی پود کو کمیونسٹ اخلاقیات کی تعلیم دیتے ہوئے کہا تھا کہ سرمایہ دار طبقہ (بورژوا) جس اخلاقیات کی تعلیم دیتا ہے، ہم اسے نہیں مانتے۔ ہم اسے دھوکا اور بے ایمانی سمجھتے ہیں۔

"ہم کہتے ہیں کہ ہماری اخلاقیات وہ ہے جو محنت کش طبقے (پرولتاری) کی طبقاتی جدوجہد کو مدنظر رکھتی ہے اور پوری طرح اس کی پابند ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پرولتاری طبقے کی طبقہ وارانہ جدوجہد کے تقاضے کیا ہیں اور اس کے واقعات کیا ہیں۔ انہی کو سامنے رکھ کر ہم اپنی اخلاقیات طے کرتے ہیں۔"

لینن نے اسی عبارت میں کہا ہے کہ پہلے سماج میں جاگیردار اور سرمایہ داروں کی حکومت قائم تھی جو کسانوں اور مزدوروں کی محنت مشقت سے خود فیض اٹھاتے تھے، ان کو لوٹ کر خود عیش کرتے تھے۔ ان لوگوں کی لوٹ مار ختم کرنے کے لئے تنظیم اور سنگھٹن کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تنظیم کارخانوں اور فیکٹریوں کے وہ مزدور ہی کر سکتے تھے جن کی آنکھیں کھل چکی ہوں اور جو ظلم کی چکی کے راز کو سمجھ چکے ہوں اور لوٹ کے نظام کو ختم کرنے کے لئے تیار اور کمربستہ ہو چکے ہوں۔ چناں چہ یہ طبقہ اٹھا۔ اس نے قدم بڑھایا، عوام اس کے ساتھ بیدار ہوئے۔ تحریک بڑھی اور دنیا کے اس ایک ملک میں انقلاب ہو گیا جہاں سرمایہ داروں کی رسی کمزور تھی۔ روس میں انقلاب ہو جانے سے دوسرے ملکوں میں بھی دھماکے کی گونج ہوئی اور وہاں بھی پرولتاری انقلاب کے لئے

لوگ چوکنے اور تیار ہونے لگے۔ اس لئے تجربہ بتاتا ہے کہ یہی وہ طبقہ ہے جو لوٹ اور ظلم کے شکار کسانوں کو، جو کل تک بکھرے ہوئے تھے متحد کر سکتا ہے۔ انھیں ایک مضبوط طاقت کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے سکتا ہے اور انھیں ساتھ لے کر ایسا سماجی نظام قائم کرنے میں پوری طاقت لگا سکتا ہے جس میں آدمی کے ہاتھوں آدمی پر ظلم نہ ہوگا اور انسان مختلف طبقوں میں بٹا ہوا نہیں رہے گا۔

"اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ وہ اخلاقی دستور جو انسانی سماج کے باہر سے آیا ہو ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ وہ محض دھوکا ہے۔ ہمارے لئے اخلاقی دستور وہ ہے جو محنت کشوں (پرولتاریوں) کی طبقاتی جد وجہد کے کام آئے اور اسی کا پابند ہو۔"

وہ اخلاقی اصول، نظریہ اور برتاؤ کیا ہوگا جو محنت کشوں کو ظلم و جبر کے نظام سے نکالنے اور آزاد سماج میں پہنچانے کے مقصد میں کام آئے اور اسی مقصد سے بنایا گیا ہو؟ یہ سوال خود حل ہو جائے گا اگر ہم یہ دیکھیں کہ انسانی تاریخ کے مختلف زمانوں میں اخلاقی اصول اور نظریے بدلتے رہے ہیں انسان نے اخلاقیات کے مختلف سانچوں کو چاہے اپنی سماجی ضرورت کا حل کہہ کر اور قانون کا نام دے کر اختیار کیا ہو یا انھیں آسمانی احکام کہہ کر اپنایا ہو، لیکن ایک حقیقت ضرور کھلتی ہے کہ اخلاقیات کا سانچہ ہمیشہ سے ایک نہیں رہا۔ جب سوسائٹی کے اندرونی رشتے بدلے ہیں۔ یا ان میں تبدیلی نمودار ہوئی ہے۔ حاوی طاقت کمزور ہوئی ہے اور اس کی جگہ دوسری طاقتیں حاوی

ہونے لگی ہیں تو اخلاقی نظام میں بھی جلد یا بہ دیر تبدیلی ہوئی ہے۔ اس طرح مختلف زمانوں میں مختلف اخلاقی نظریے رہے ہیں۔ کبھی مذہبی احکام کے نام سے کبھی قانون کے نام سے کبھی تہذیبی دستور کے طور پر۔ ایک اخلاقی نظام آتا ہے تو وہ یا اپنے سے پہلے نظام کو منسوخ کرتا ہے یا اس میں کانٹ چھانٹ کرتا ہے اور اسے اپنی سماجی ضرورت کے مطابق ڈھالتا ہے۔ مسیحی نظامِ اخلاق جو خوش حال جاگیرداری اور دستکاری عہد کے شباب کے زمانے میں پورے یورپ اور یورپ سے باہر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں ترمیم ہوئی اس وقت جب جاگیرداری کا قلعہ ٹوٹنے لگا اور بڑے بیوپاری اور درمیانہ درجے کا سرمایہ دار طبقہ ابھرا۔ انھوں نے پروٹسٹنٹ مذہب کے نام سے پرانے اخلاقی برتاؤ، لین دین اور اخلاقی اصولوں میں ترمیم کر دی۔

اسی طرح یہ ہوتا ہے کہ ایک اخلاقی اصول کسی ایک ملک یا قوم کے نزدیک اعلا ہے تو دوسرے ملک یا دوسری قوم کی نظر میں وہ گرا ہوا ہے جو اخلاقی برتاؤ اسی ایک زمانے میں انگلینڈ میں تعریف کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، وہی ہندوستان میں برا سمجھا جاتا ہے۔ اور جو اخلاقی نظام ہندستان میں مستحسن ہے وہ فرانس میں معیوب ہے۔

صرف اسی پر بس نہیں بلکہ ایک زمانے میں، ایک ملک کے اندر ایک قوم میں کئی کئی اخلاقی نظام قائم رہتے ہیں۔ شہریوں کی سماجی مساوات کا جو اصول رومن جمہوریتوں میں برتا جاتا تھا وہ صرف رومن آزاد شہریوں کے لئے تھا، انھی جمہوریتوں کے غلام باشندوں کے لئے نہیں تھا۔ بالکل ابتدائی

مسلمان حکومتوں میں جو اخلاقی اصول مسلمان باشندوں کے لئے رکھے گئے تھے، وہ غیر مسلم باشندوں کے لئے لازم نہیں تھے۔

ان کھلی ہوئی حقیقتوں سے جو اصول نکلتے ہیں ان میں دو بہت اہم ہیں ایک تو یہ کہ اخلاقی اصول ہمیشہ ہمیش کے لئے نہیں ہوتے۔ اور دوسرے یہ کہ مختلف طبقوں کے لئے یکساں نہیں ہوتے اور اسی تحقیق پر پہنچ کر مارکسزم نے یہ دریافت کیا ہے کہ ہر سماج میں اور تاریخ کے ہر ایک دور میں ان طبقوں نے جن کے ہاتھ میں طاقت اور اقتدار کی کنجیاں تھیں اپنی سہولت کے لئے اخلاقی قانون نافذ کئے ہیں اور اخلاقی نظام تیار کئے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں جو طاقتیں اُبھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی ہیں وہ اپنی سہولت کے لئے دوسرے اخلاقی قوانین اختیار کرتی ہیں اور ان کے اخلاقی اصول مختلف ہوتے ہیں اور اس طرح انسانی تاریخ جتنی آگے بڑھتی گئی ہے پرانے اخلاقی اُصولوں کے کھنڈر یا تو پیچھے چھوڑتی گئی ہے یا ان میں سے اپنی ضرورت کا سامان لے کر نئی عمارت تعمیر کرتی گئی ہے۔

تفصیلی بحث کے بجائے بہتر ہے کہ خود مارکسزم کے اولین رہنما اور کمیونسٹ مینی فیسٹو کے ایک مُصنف فریڈرک اینگلز کی تحریر پیش کر دی جائے۔ جرمن فلسفی ڈیہرنگ کا خیال تھا کہ اخلاقی قدریں ہمیشہ کے لئے ہوتی ہیں اخلاقی اُصول دوامی ہوتے ہیں اور انھیں دوامی ہونا چاہیئے۔ ڈیہرنگ پر سخت تنقید کرتے ہوئے اینگلز نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"خیر اور شر (نیکی اور بدی) کے تصور ایک قوم کے مقابلے میں دوسری

قوم میں اور ایک زمانے کے مقابلے میں دوسرے زمانے میں اس قدر مختلف اور الگ الگ رہے ہیں کہ اکثر تو یہ ہوا ہے کہ وہ (صرف مختلف ہی نہیں تھے بلکہ) ایک دوسرے کی ضد تھے .... آج ہمارے سامنے اخلاقیات کے کون سے اصول پیش کئے جاتے ہیں؟ اوّل تو وہی گھسی پٹی جاگیرداری اخلاقیات۔ جو ایمان بالغیب کی پچھلی صدیوں سے چلی آ رہی ہیں۔ اس کی بھی دو بڑی شاخیں ہیں۔ ایک کیتھولک اخلاقی دستور۔ دوسرے پروٹسٹنٹ اخلاقی اصول (ان کی بھی الگ الگ شاخ در شاخ چلی گئی ہے۔ ماضی کے اس اخلاقی ضابطے کے ساتھ ہی) موجودہ زمانے کے اخلاقی اصول ہیں۔ اور پھر انھی کے ساتھ آنے والے زمانے کا پرولتاری اخلاقی اصول ہے۔ یوں دیکھئے تو یورپ کے نہایت ترقی یافتہ ملکوں میں ہی اس وقت ماضی، حال اور مستقبل کے تین الگ الگ اخلاقی نظریوں کے گروہ موجود ہیں، جن پر بیک وقت عمل کیا جا رہا ہے اور وہ ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ اب پوچھئے کہ ان میں صحیح اخلاقی نظریہ کون سا ہے؟ اگر قطعی طور پر صحیح اور بالکل صحیح نظریہ دیکھا جائے تو کوئی ایک نہیں ہے۔ لیکن ہاں، وہ اخلاقی نظریہ جس میں زیادہ سے زیادہ ایسے عناصر موجود ہیں جو آئندہ بھی باقی رہیں گے اور پائیدار نکلیں گے۔ وہی ایسا اخلاقی نظریہ ہے کہ موجودہ زمانے میں وہ حال کے خاتمے اور مستقبل کی آمد کو پیش کرتا ہے۔ اور یہ اخلاقی نظریہ ہے پرولتاریوں (مزدور طبقے) کا۔

لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ سماج کے تین طبقے یعنی جاگیر دار شرفا، سرمایہ دار (بورژوا) اور پرولتاری (مزدور طبقہ) کا اپنا اپنا الگ اخلاقی دستور موجود ہے تو ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ لوگ، چاہے انھیں اس کی خبر ہو یا نہ ہو، بالآخر وہ جو اخلاقی تصوّر اور جو اخلاقی خیالات قائم کرتے ہیں، وہ ان عملی تعلقات سے حاصل کرتے ہیں جن پر اُن کی طبقاتی پوزیشن کی بنیاد رکھی ہے۔ یعنی وہ معاشی تعلقات جن کے مطابق پیداوار اور لین دین کا بیوپار ہوتا ہے (ان میں اپنی حیثیت کے مطابق وہ اخلاقی تصور پیدا کرتے ہیں)"

اسی بحث میں اینگلز نے بتایا ہے کہ اخلاقی نظاموں کے الگ الگ خانے نہیں ہوتے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک سماج میں کئی کئی اخلاقی دستور چل رہے ہیں لیکن ان میں اکثر باتیں مشترک بھی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اخلاقی اُصول یا دستور ان مختلف اخلاقی ضابطوں میں پائے جاتے ہیں وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے صحیح ہیں اور ازل سے چلے آتے ہیں۔ نہیں بلکہ ان کے پیچھے سماج کے تاریخی ارتقا کا راز موجود ہوتا ہے۔ اب جیسے کوئی شخص کہے کہ "چوری کرنا جرم ہے" یہ ایک ایسا اخلاقی اصول ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کے اخلاقی نظام میں بے ترمیم جگہ پائے گا۔ لیکن یہ کہنا بھی غلط ہے۔ کیوں کہ جس سماج میں کسی آدمی کو چوری کی ضرورت نہ رہ جائے گی اور چوری کا رحجان ہی اطمینان بے فکری اور محنت و راحت کی طویل زندگی گزار چکنے کے بعد ختم ہو چکا ہوگا، وہاں کسی شخص سے یہ کہنا بالکل بے معنی ہوگا کہ چوری نہ کرو "چوری کرنا جرم ہے"۔

اینگلز نے اسی باب میں آگے چل کر بحث کو مختصر کیا ہے کہ :-
"ہم کہتے ہیں کہ تجزیہ اور چھان بین کی جائے تو بالآخر یہ نکلے گا کہ پہلے کے جتنے اخلاقی نظریے ، رہے ہیں وہ سب کے سب نتیجہ ہیں اس معاشی سطح کا جس پر سماج مختلف زمانوں میں پہنچتا رہا ہے اور چوں کہ سماج آگے بڑھنے میں طبقوں کے ٹکراؤ اور ان کی کش مکش کی جانب بڑھتا گیا ہے اس لئے اخلاقی دستور ہمیشہ سے طبقوں کے اخلاقی دستور رہے ہیں کہ یا تو ان کے ذریعے حاکم طبقے کی حکمرانی اور اس کے مفاد کو جائز اور درست قرار دیا گیا ہے ورنہ اگر کچلے ہوئے طبقے کافی طاقت ور ہو گئے ہیں تو ان اخلاقی دستوروں کے ذریعے کچلے ہوئے طبقوں کی بغاوت کو اور آگے چل کر ان کے مقصد اور مفاد کو پیش کیا گیا ہے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طریقے سے اخلاقیات (اخلاقی اصولوں اور دستوروں) میں مجموعی طور سے ترقی ہوتی رہی ہے لیکن ابھی تک ہم اس طبقہ وارانہ اخلاقیات کے دور سے گزرے نہیں ہیں۔ صحیح معنوں میں انسانی اخلاقیات کی وہ منزل جو طبقہ وارانہ اخلاقیات کو پار کر کے آئی ہو۔ اور طبقہ وارانہ اخلاقیات کے بچے کھچے اثرات سے بھی پاک ہو چکی ہو۔ اسی وقت آسکتی ہے جب سوسائٹی اتنی بلندی پر پہنچ جائے کہ سوسائٹی کے اندر سے طبقہ وارانہ ٹکراؤ بھی مٹ چکے ہوں اور ان کے علاوہ طبقہ وارانہ تضادوں اور مخالفتوں کی یاد بھی روزمرہ کی زندگی

سے بالکل بُھلائی جا چکی ہو۔"

اس سے ظاہر ہے کہ کیمونسٹ جن اخلاقیات کو مانتے ہیں اور جنھیں اپنے یہاں پھیلانا چاہتے ہیں وہ ایسی اخلاقیات ہیں کہ انسانی تاریخ میں جب سے سماج دو یا دو سے زیادہ (مخالف) طبقوں میں بٹا ہے اس وقت سے آج تک ان کی مثال نہیں ملتی۔ اختصار کی خاطر ہم یہاں اخلاقیات کی بڑی بڑی اصطلاحوں میں سے صرف ایک کو لئے لیتے ہیں۔ مساوات۔

جب انسانی سماج کا بچپن تھا اور قبائلی زندگی چھوٹی چھوٹی بستیوں کی حد میں داخل ہو رہی تھی، دھات کے اوزار استعمال ہونے لگے تھے، اس وقت بھی ان بستیوں میں سماج کی بہتری کے لئے مساوات کا اخلاقی اصُول اپنایا گیا۔ اس مساوات کا مفہوم یہ تھا کہ بستی کے بوڑھے، جوان، بچے ہر ایک کو برابر کے حقوق حاصل تھے۔ لیکن پردیسیوں کو، عورتوں کو اور غلاموں کو کسی قسم کا کوئی حق نہ تھا۔ اس کے بعد جب رومن سلطنت قائم ہوئی تو اس نے مساوات کا مفہوم اور پھیلایا۔ لیکن غلاموں کو پھر بھی مساوی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ پھر مسیحیت کا دور شروع ہوا۔ مسیحیت زمین کے جس خطے سے شروع ہوئی وہاں سماج صاف صاف دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ غلام اور غلاموں کے آقا۔ یہ آقا اپنے غلاموں سے کام لیتے تھے، ان کی خرید و فروخت کرتے تھے انھیں زمین کی طرح اپنی جاگیر سمجھتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال بیاہ شادی، دوا دارو کی ذمہ داری بھی آقاؤں پر ہوتی تھی۔ چناں چہ وہاں مساوات کی وہ جو پہلی شکلیں تھیں ٹوٹ گئیں اور مساوات کا صرف ایک

تصور رہ گیا کہ سب انسان گناہ گار پیدا ہونے میں برابر ہیں۔ اور خدا کے حضور میں برابر ہیں۔ مشترک ملکیت اور برابر کی ملکیت کا جو اخلاقی اصول چلا آرہا تھا وہ بھی دھیرے دھیرے ختم ہو گیا۔ پھر اسلام آیا۔ اسلام دنیا کے بے حد بنجر اور بکھرے ہوئے قبائلی علاقے میں نمودار ہوا۔ جہاں غلاموں کو صرف اس لئے قتل کر دیا جاتا تھا کہ انھیں زندہ رکھ کر کوئی فیض نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ جہاں لڑکیوں کو قتل کر دینا اخلاقی بلندی اور شرافت کا ثبوت تھا اور جہاں اب معمولی تجارت (جنس سے جنس کا تبادلہ) آگے بڑھنے لگی تھی۔ اور دوسرے مہذب ملکوں سے بیوپار بڑھ چلا تھا۔ عرب وہ ملک تھا جہاں انتقام اور انتقام در انتقام محبوب مشغلہ تھا۔ چناں چہ وہاں کے اخلاقی نظام میں غلاموں سے مساوات برتنے، انھیں کاروبار میں لگانے اور محنت لینے کا اصول قرار پایا۔ عورتوں اور غلاموں کو مساوات کا حق دیا گیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ غلاموں سے محنت لو اور عورتوں کو قتل مت کرو۔ اور انتقام کا سلسلہ روک کر نسل بڑھاؤ۔ آریہ نسل کی مختلف شاخوں (ہندستانی، ایرانی، یورپین، وغیرہ) نے بھی مساوات کا اخلاقی اصول اپنایا۔ مگر اس کی صورت یہ تھی کہ الگ الگ ورن اور ذاتوں میں اندرونی مساوات۔ بیاہ شادی کے رشتے، نسلی مساوات۔ اور ایک پیشہ کرنے کی مساوات، الگ الگ پیشہ کرنے والوں کی باہمی مساوات۔

اس طرح سے قدیم اور درمیانی زمانوں میں مساوات کا اخلاقی اصول مختلف معنی اور مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا ہے۔ اور جیسے جیسے سماج آگے بڑھتا

گیا۔ مساوات کا اخلاقی اصول بھی اپنا مفہوم پھیلاتا گیا۔ درمیانی زمانہ یورپ اور ایشیا (اور شمالی افریقہ) میں بڑی بڑی سلطنتوں کا زمانہ ہے۔ ان بڑی سلطنتوں کے زمانے میں مساوات کے اصول کی بڑی مٹی پلید ہوئی۔ مغربی یورپ میں جاگیرداری سماج جلدی ہی جوان ہوا اور جلدی ہی ڈھل گیا۔ چناں چہ اس کی جوانی کے زمانے میں جو طبقہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا۔ جس کے پاس زمینوں کی آمدنی، بیوپار اور دستکاری کے کاروبار سے کافی زر و مال جمع ہونے لگا تھا۔ وہ جاگیرداری سلطنتوں کے بڑھاپے کے زمانے میں طاقت پکڑنے لگا۔ اور جیسے ہی دوسرے ملکوں کے دروازے کھلے، بحری آمد و رفت بڑھی تو دوسرے ملکوں میں پاؤں پھیلانے اور زیادہ بڑے پیمانے پر، زیادہ بڑے سرمائے سے کاروبار کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ اور جب اس ضرورت کو پورا کیا جانے لگا تو منافع بڑھ جانے اور دولت اکٹھا ہو جانے کی بنیاد پر کارخانے بننے شروع ہوئے۔ یعنی جاگیرداری اور دستکاری سماج کے بطن سے سرمایہ داری سماج نے جنم لیا۔ جاگیردار شرفا کی جگہ اب سرمایہ دار حاوی ہونے لگے۔ اور انھیں ضرورت پیش آئی کہ رعایا (کسانوں) کو مقررہ کھیتوں کی پابندی سے آزاد کرانے کے لئے۔ انھیں کارخانوں میں لانے کے لئے، سرمائے کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں لیے پھرنے کے لیے وہ اخلاقی اصول وضع کئے جائیں جو جاگیرداری کی بندشوں کو توڑ دیں، اس کے وجود کو اخلاقی پستی قرار دیں اور سرمایہ داروں کی کامیابی کی راہ تیار کریں۔ چناں چہ مساوات کے اخلاقی اصول کو اور زیادہ وسعت دی گئی۔ یعنی پہلے مساوات صرف قبیلے کے مردوں تک محدود

تھی۔ اس کے بعد بستی کے رہنے والوں کے حقوق ملکیت تک پہنچی۔ پھر وہ الگ الگ ریاستوں اور حکومتوں میں بسنے والے مختلف پیشہ وروں کے اندرونی سماجی معاملات تک آئی اور اسی کے ساتھ مختلف سلطنتوں میں رہنے والے لوگوں میں ایک عقیدے اور دھرم کے لوگوں کے درمیان مساوات قرار پائی اور اب سرمایہ دار طبقے نے اپنی سہولت اور ضرورت کے لئے مساوات کا مفہوم یہ قرار دیا کہ انسان انسان سب برابر۔ لہٰذا سب کے سماجی اور سیاسی حقوق برابر۔ اور یہ پہلا موقع تھا جب اخلاقی اصول کو مذہبی احکام کی صورت میں نہیں بلکہ استدلال کی صورت میں پیش کیا گیا۔ مثلاً فرانس میں روسو اور والٹیر نے بورژوا طبقے کے اس اخلاقی اصول کو فلسفیانہ تحقیق اور طاقت ور نعرے کی شکل دی۔ سرمایہ دار طبقے نے مساوات کو اخلاقی اصول بنا کر یہ چاہا کہ اس کے زور سے کسانوں کو جہاں وہ چاہیں وہاں اور جیسا وہ چاہیں ویسا کام کرنے کی آزادی ملے۔ جاگیر دار حکومتوں کو اور پرانے فوجی امیروں، رئیسوں، خطاب یافتہ اور شرفا اور شاہی خاندانوں کو سرمایہ دار طبقے کے مفاد کی راہ میں حائل ہونے کی جرأت نہ ہو، پابندی لگانے کا اختیار نہ ہو، خاص حقوق ختم کر دیئے جائیں اور کھلے بازار میں مقابلہ کرنے کی آزادی ہو تو اس نے کہا کہ انسانوں میں مساوات ہونی چاہیئے۔ کسی قسم کی کوئی طبقاتی اونچ نیچ نہ برتی جائے لیکن سرمایہ داری کی سرگرمیوں نے بھی مارکس کے بقول خود اپنی قبر کھودنے والے (صنعتی) مزدور طبقے کو جنم دیا تھا۔ صنعتی سرمایہ داری کی سرگرمی کا دائرہ جتنا بڑھا، اتنا ہی

مزدور طبقہ بھی بڑھا اور اس کی تنظیم بڑھی۔ اس نے مساوات کے اخلاقی اصول کو وہ مفہوم دیا جو اگرچہ خود سرمایہ دار طبقے کی بتائی ہوئی مساوات سے ہی لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بالکل برعکس تھا۔ یعنی انسان، انسان سب برابر۔ سب کی سماجی اور سیاسی حیثیت برابر۔ لیکن اس کی تکمیل کی راہ میں الگ الگ (مخالف) طبقوں کا وجود حائل ہے۔ ان طبقوں کو ہی ختم کر دیا جائے۔ اور محنت کو سب کا حق اور سب کا فرض قرار دیا جائے۔ یہ صدا سب سے پہلے اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے بالکل ابتدائی برسوں میں فرانس سے آئی (سینٹ سائمن نے اسے مذہبی روپ سے بھی پیش کیا تھا)

دبے کچلے طبقوں نے، غلاموں نے، رعایا نے، کسانوں نے، محکوم قوموں نے اس سے پہلے بھی بارہا حاکم طبقوں کے خلاف آواز اٹھائی تھی، اور خود حاکم اور جابر طاقت کے اخلاقی اصولوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا تھا۔ انھوں نے مساوات کا مطالبہ بھی کئی بار پیش کیا۔ لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مساوات کا مفہوم تمام معاشی، سماجی اور سیاسی دائروں تک پھیل سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ جبھی ممکن تھا جب سرمایہ دار طبقہ مساوات کو اپنا اخلاقی اصول بنا کر پہلے ہی کافی وسعت دے چکا ہو۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنے سماجوں کے بدلنے پر بھی مساوات کا اخلاقی اصول تو بہرحال باقی رہا، اور سب کے لئے باقی رہا۔ لیکن یہ محض دکھاوے کی بات ہے۔ مساوات کا وہ اخلاقی اصول جو بالکل ابتدائی سماج کے بعد غلام و آقا کے سماج میں اپنایا گیا اس میں مساوات کا مطلب

سیاسی اور سماجی حقوق کی برابری کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ مساوات تو بہت دُور کی بات ہے، خود بورژوا سوسائٹی جو عہدِ حاضر کی چیز ہے اور جس کے خمیر سے پرولتاریوں کا اصول مساوات تیار ہوا ہے، مساوات کے جس اخلاقی اصول کا دعویٰ کرتا ہے وہ پرولتاری طبقے کے اصولِ مساوات کے بالکل برعکس ہے اور مساوات کا یہ نیا اخلاقی تصور پہلے تصور کی ضد اور اس کی موت ہے اسی کو اینگلز نے کہا ہے:۔

"مساوات کا تصور دونوں شکلوں میں۔ بورژوا صورت میں بھی اور پرولتاری صورت میں بھی تاریخ کی پیداوار ہے۔ اس تصور کی پیدائش کے لئے ضروری تھا کہ وہ مخصوص تاریخی حالات قائم ہو چکے ہوں جن سے پہلے تاریخ ترقی کا ایک لمبا راستہ طے کر چکی ہو۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ (مساوات) ہرگز ہمیشہ ہمیش سے قائم رہنے والی حقیقت نہیں ہے۔"

پرولتاری طبقہ مساوات کے جس اخلاقی اصول کو اپناتا ہے، اس کی روح یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسرے کی محنت سے خود فیض نہ اُٹھائے، استحصال نہ ہو۔ سماج میں ایک یا کئی شخص ذرائع پیداوار کے مالک اور دوسرے اس سے محروم نہ ہوں۔ ذرائع پیداوار کی ملکیت کا حق سب کو برابر ہو۔ اور یہی ہے وہ حقیقت جسے لینن نے ان لفظوں میں بیان کیا:۔

"جب لوگ ہم سے اخلاقیات کی باتیں کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ کمیونسٹ کی نظر میں اخلاقیات کے معنی یہ ہیں کہ: پوری طرح ایک دوسرے سے پیوستہ، جڑا ہوا اور متحد (سیہ خلفشار) ڈسپلن اور

دوسرے کی مشقت کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنے والوں کے خلاف سوچی سمجھی ہوئی عوام کی جد وجہد۔ ہم اسے نہیں مانتے کہ اخلاقیات کے دستور ہمیشہ سے ایک سے چلے آ رہے ہیں اور ایسے ہی باقی رہیں گے اخلاقیات کے متعلق جتنی افسانہ تراشی ہے، ہم اس کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ اخلاقیات کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسانی سماج کو اور زیادہ بلندی پر پہنچنے میں اور محنت کشوں کو لوٹنے کا جو سلسلہ ہے اس کا خاتمہ کرنے میں مدد ملے۔"

اخلاقیات کے اصول سے کام لے کر انسانی سماج کو آگے لے جانے اور زیادہ اونچا اٹھانے کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے لیکن دو شکلوں میں۔ ایک تو یہ کہ حکمران طبقے اپنے اقتدار کو پھیلانے کے لئے اخلاقی اصول اس طرح سے وضع کرتے ہیں جو پورے سماج کے اخلاقی اصول بنا دئے جائیں، اور اس طرح وہ دوری جو حکمراں اور محکوم کے درمیان ہوتی ہے کم ہو جائے۔ وہ ٹکراؤ جو دونوں کے درمیان ہوتا ہے، بے اثر یا بے ضرر رہ جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ محکوم طبقوں میں سے نئی طاقتیں باشعور ہوتی ہیں۔ انھیں نظر آتا ہے کہ جو موجودہ سماجی تعلقات ہیں ان کی جکڑبندی میں رہتے ہوئے ان کی ترقی، خوش حالی اور فلاح و بہبود کا امکان نہیں ہے۔ وہ خود زور لگاتے ہیں اور بہبو ... اس جد و جہد میں یا تو خود پچھلے اخلاقیات میں کانٹ چھانٹ کرکے، ورنہ نئے اخلاقی اصول ... ایجاد کرکے انھیں حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جب یہ محکوم طبقہ یا ابھرتی ... ہوئی نئی طاقتیں اپنے حریفوں سے

اقتدار چھیننے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو ان کے مقررہ اخلاقیات پورے سماج میں اسی طرح اور اسی مقصد سے پھیلائے جاتے ہیں جیسے پچھلے حکمراں طبقے یا حاکم اور با اقتدار طبقوں نے پھیلا رکھے تھے۔

دیوتاؤں کی کثرت اور خدا کی وحدانیت مذہبی عقیدے ہیں لیکن ان عقیدوں سے جو اخلاقی اصول نکلے ہیں، جو اخلاقیات کے دستور بنے ہیں ان کے پیچھے بھی یہی راز ہے۔ وحدانیت کے مذہبی عقیدے سے سماج کو مثلاً ایک یہ اخلاقی اصول دیا گیا کہ "اَشِدّٓاءُ عَلَی الْکُفّٰارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ (تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحم، مدارات، تواضع اور بردباری سے پیش آؤ۔ لیکن جو لوگ تمھارے حریف بنیں، ان کے مقابلے میں سخت اور بے رحم بن جاؤ) ظاہر ہے کہ اس اخلاقی اصول نے عرب کے قدیم بکھرے ہوئے سماج کو زیادہ بلندی کی طرف لے جانے، متحد کرنے اور خوش حال بنانے میں مدد دی۔ اور پھر یہی اخلاقی اصول اس پورے سماج کا ایک عام اصول بن گیا۔

"اپنے پڑوسی سے محبت کرو۔" اخلاقی اصول نے اس سماج کو پھلنے پھولنے میں مدد دی۔ جو چھوٹی چھوٹی ہمسایہ ریاستوں کے سہارے کھڑا ہو، اور جہاں ایک ریاست (پنچائتی ریاستوں) کو زندہ اور برقرار رہنے کے لئے دوسری ریاست پر حملہ کرنے کی اور اسے لوٹ لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

یہ اور ایسے ہی دوسرے واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو لینن کے قول کی سچائی کو ثابت کرتا ہے۔ طبقات میں بٹے ہوئے سماج کے اصولوں کا تجزیہ کیا جائے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اخلاقی اصول دائمی اور ابدی نہیں ہوا

کرتے۔ ان میں سماجی ضرورت اور سماجی ارتقا کے مطابق تبدیلی ہوتی رہی ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم طبقوں نے اخلاقی اصولوں کو اس لئے استعمال کیا ہے کہ ان کے ذریعے اپنے اقتدار کو پورے سماج کے لئے قابلِ قبول بنایا جائے اور اپنے طریقِ کار کو جائز اور درست قرار دیا جائے۔ حکمراں طبقے اپنا اقتدار قائم رکھنے اور کھل کر سرگرمیاں دکھانے کے لئے جہاں طاقت کا ناگوار استعمال ضروری سمجھتے ہیں وہیں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ زیادہ گوارا طریقے اختیار کریں۔ یہ گوارا طریقہ اخلاقیات کے اصولوں کا ہے جو تلوار کی دھار کو نیام کر کے اسے ترغیب اور تعلیم کی صورت دے دیتا ہے۔

اس حقیقت کی مارکسزم نے تو بعد میں تصدیق کی، اس سے پہلے اکثر انسانیت دوست اور آزاد خیال فلسفیوں اور مفکروں نے تاریخ کی روشنی میں اس کا پتہ چلا لیا تھا۔ درمیانی عہد کے کئی مفکروں نے جن میں ابن خلدون سے لے کر جان لوک (John Locke) تک شامل ہیں، اپنے اپنے طور پر یہ اشارہ کیا ہے کہ اخلاقی نظریات وہ ہتھیار ہیں جنھیں اصل ہتھیاروں کے بجائے استعمال کیا جاتا ہے۔ عمر خیّام ایران کے متوسط طبقے کا ایک آزاد خیال فلسفی تھا، اس نے اپنے یہاں کے حالات کو دیکھ کر کہا کہ اخلاقیات آسمانی نہیں ہوتے بلکہ "شیخ شہر اور محتسب" کی ریاکاری کا نتیجہ ہوتے ہیں جان لوک نے تو تفصیلی بحثیں اور ثبوت پیش کر کے بتایا کہ وہ ادارے (سرکاری اور مذہبی) جو دوسروں کی محنت پر بسر کرنے سے زندہ ہیں اور وہ اخلاقی نظریات کے ذریعے اپنا اقتدار باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مارکسزم نے زیادہ ٹھوس اور سائنٹفک طریقے سے اس حقیقت کو دریافت کیا اور بتایا کہ مادّی طاقت اور اخلاقی اصولوں کی طاقت، دونوں کا کیا رشتہ ہے اور کتنا قریبی رشتہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ہمزاد کی طرح کام کرتے ہیں۔

حکمراں طبقوں کے پاس تلقین، تبلیغ اور پرچار کے سارے ذریعے ہوتے ہیں۔ اشوک کی لاٹ سے لے کر ریڈیو اور فلم تک۔ وہ ان ذریعوں سے اپنے اخلاقی اصولوں کو پھیلاتے ہیں۔ ان اخلاقی اصولوں کے پرچار کی بدولت فوجی قوت اور زبردستی کا استعمال کم ہوجاتا ہے اور طبقاتی ٹکراؤ کی تلخی کام و دہن کو راس آنے لگتی ہے۔ انھیں سماج کے برقرار رکھنے کا ایک لازمہ سمجھ لیا جاتا ہے اور جیسے جیسے سماج پر اس حکمراں طبقے کی گرفت کمزور پڑنے لگتی ہے اس کے اخلاقی اصولوں کی ہمہ گیری اور اس کی اہمیت بھی گھٹنے لگتی ہے۔

زمین خدا کی ہے اور بادشاہ خدا کا سایہ ہے۔ اس بنیاد پر "وفاداری" کے اخلاقی اصول میں بڑی طاقت اور ہمہ گیری موجود تھی۔ لیکن جب زمین پر کارخانے نمودار ہوئے، سرمایہ دار طبقہ اُبھرا، اور مناصب اور جاگیریں تقسیم کرنے والے بادشاہوں کی گرفت کمزور پڑی تو وفاداری کا اخلاقی اصول بھی بے معنی ہوگیا اور اس کی جگہ یہ اصول قرار پایا کہ رضا و رغبت کے ساتھ خریداری کے علاوہ دوسرے طریقے سے کسی کی ملکیت کو قبضانا جرم ہے۔ بظاہر یہ اصول ہمہ گیر اور دوامی معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کے پیچھے سرمایہ دار طبقے کی قوتِ خرید اور محنت کش طبقوں کی بے سرمائگی اور ناداری کا ٹکراؤ ہے

جو چھپا دیا گیا ہے اور سرمایہ دار (حاکم) طبقوں نے یہ اخلاقی اصول پورے سماج میں اس طرح پھیلایا ہے کہ وہ گویا سماج کے پُرامن رہنے اور برقرار رہنے کا ایک لازمہ ہے۔ اگر یہ اخلاقی اصول ٹھکرایا گیا، اگر اس اخلاقی بندش کو توڑ دیا گیا تو پورا سماج درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ سرمایہ دار طبقے نے اقتدار حاصل کرنے کی جد و جہد میں اس اخلاقی اصول کے ذریعے دوسرے دبے ہوئے طبقوں کی طرف داری حاصل کی ہے۔ اس اخلاقی اصول سے اس نے سماجی حالات کو ترقی دینے میں مدد لی ہے، اور اس کی بدولت اپنا اقتدار قائم رکھنے اور اسے گوارا بنانے میں کام لیا ہے۔

صنعتی مزدوروں کا پرولتاری طبقہ اور اس کے ساتھ دوسرے محنت کش طبقے سرمایہ داروں کی مٹھی سے اقتدار چھیننے اور سرمایہ داری سے آزاد ہونے کی جد و جہد میں اس اخلاقی اصول کو بے معنی بلکہ اپنا مخالف سمجھتے ہیں، وہ زمین کو، دریاؤں، ریلوں، جنگلوں، کارخانوں، کانوں اور پیداوار کے تمام دوسرے ذریعوں کو پورے سماج کی ملکیت قرار دیتے ہیں اور ان کے مالک افراد کو معاوضہ دئے بغیر قبضانے اور سماج کی ملکیت بنا دینے کو اپنا اصول بناتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ جرم ہے کہ جہاں سماج محنت کرتا ہے وہاں پرائیویٹ قبضہ باقی رہے اس طرح جو چیز سرمایہ داروں کی حکمرانی میں اخلاقی (اور قانونی) جُرم سمجھی جاتی ہے وہی یہ پرولتاری حکمرانی کے سماج میں اخلاقی اصول بن جاتی ہے اور جو وہاں اخلاقی اصول تھا، یہاں جُرم قرار پاتا ہے۔ جیسے جیسے اور جہاں جہاں سرمایہ دار طبقے کی گرفت

کمزور پڑتی جاتی ہے ان کے اخلاقی اصول کی طاقت اور ہمہ گیری بھی ختم ہوتی جاتی ہے اور اس کی جگہ نیا اخلاقی اصول استوار ہوتا جاتا ہے۔ چناں چہ جن ملکوں میں پرولتاری طبقے نے سرمایہ داروں سے اقتدار چھینا اور اپنی حکمرانی یا اقتدار قائم کیا وہاں اپنے اسی اخلاقی اصول کو عام کیا اور پرانے اخلاقی اصول کو رد کر دیا۔ کیوں کہ وہ اخلاقی اصول مزدور طبقے کی نجات، اس کی آزادی اور اقتدار کی راہ میں حائل تھا اور نیا اخلاقی اصول مزدور طبقے اور محنت کشوں کے اقتدار کو پھیلانے، ہمہ گیر کرنے اور سماج کو اور زیادہ آگے بڑھانے، اس کی پیداواری سرگرمی کو تیز کرنے اور خوش حالی لانے میں مدد دیتا ہے۔ یہاں بھی صورت وہی ہے کہ حکمراں (مزدور) طبقہ اپنی اخلاقیات کو اقتدار حاصل کرنے کے لئے، اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے، اور سماج کو انسانی تاریخ کو اور زیادہ بلندی پر لے جانے کے لئے اور اسے پورے سماج کا اخلاقی اصول بنانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مزدور طبقے کے اقتدار کے تحت جو سرمایہ دار یا جاگیردار عناصر (عارضی طور پر) باقی رہ جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ پرولتاری طبقے کا یہ اصول، اگرچہ پورے سماج کا اخلاقی اصول کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ ان کا اخلاقی اصول نہیں ہے بلکہ انھیں دبائے رکھنے اور پرانے اقتدار کے آخری نشان کی طرح ان کے اخلاقیات کو اور ان کے طبقاتی وجود کو ختم کر دینے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح جاگیردار طبقے کے اخلاقی اصولوں کو توڑ کر اور انھیں مٹا کر سرمایہ دار طبقہ اور اس کا سماج

نہیں مٹا بلکہ اور زیادہ طاقت ور ہوا۔ اسی طرح سرمایہ دار طبقے کے اخلاقی اصول کو توڑ کر اور انھیں مٹا کر نیا سماج درہم برہم نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ ہمہ گیر، زیادہ مضبوط، زیادہ یک جہت اور زیادہ خوش حال ہو رہا ہے۔

اور چوں کہ پرولتاری طبقے اور اس کی رہنما کمیونسٹ تحریک کا رُخ یہ ہے کہ پرولتاریوں کا اقتدار ہو۔ محنت کشوں کا سماج ہو اور اس میں سے دوسروں کی محنت پر بسر کرنے والے طبقے بالکل ختم کر دیے جائیں لہٰذا کمیونسٹ اخلاقیات وہ اخلاقیات ہیں جن سے پہلے تو پرولتاری طبقے کا اقتدار قائم کرنے، اسے مضبوط کرنے اور اسے ہمہ گیر بنانے میں مدد ملے اور پھر ایک ایسا سماج تعمیر کرنے میں مدد ملے جہاں ایک دوسرے کے مخالف طبقوں کا وجود نہ رہے۔ جہاں فرد کی آزادی اور اس کی مسرت کا ٹکراؤ سماج کے اندرونی رشتوں سے نہ ہوتا ہو۔ جہاں ہر فرد اور سماج کی تمناؤں کا رُخ ایک سمت ہو۔ جہاں فرد اور سماج کی خواہش میں ہم آہنگی ہو اور جہاں پیداواری امکانات بڑھنے اور تاریخ کا سفر منزل بہ منزل طے ہونے کے ساتھ ساتھ ہر فرد کی خوش حالی اور ترقی بھی ہوتی جائے۔

اس طرح سے کمیونسٹ اخلاقیات ایک آئینہ ہے جس میں آنے والے بے طبقہ سماج کی جھلک نظر آتی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جسے لینن نے کہا تھا کہ:۔

"ہم اس اخلاقیات کو نہیں مانتے جو انسانی سماج کے باہر سے نازل ہوئی ہو۔ وہ دھوکہ ہے۔ ہمارے نزدیک اخلاقیات وہ

ہے جو پرولتاریوں کی طبقاتی جد و جہد کے مقاصد اور اس کی ضروریات میں کام آئے"۔

جائز اور ناجائز کا تصور باقی رہتا ہے لیکن اس کے لئے ضرورت نہیں رہتی کہ گناہ اور ثواب کے آسمانی احکام بھی اس کے ساتھ جوڑے جائیں بلکہ سماج کی ساخت، اس کا ڈھانچہ ایسا ہوتا ہے، اس کے اندر معاشی تعلقات اور عوام کی سوجھ بوجھ اور شعور اتنا ترقی یافتہ ہوتا ہے کہ وہ جائز اور ناجائز کا ایک بلند تصور رکھتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی پر مجبور نہیں ہوتے۔

انسانیت، مساوات، اخوت ایک دوسرے کی مدد، وفاداری، محنت ایمان داری، خوش خلقی، عدل، معاملہ فہمی اور اسی طرح کی دوسری اخلاقی اصطلاحیں جو آج تک چلی آتی تھیں، کمیونزم کی تحریک نے ان کی جگہ نئی اخلاقیات کو پیش کیا ہے۔ جس میں مساوات بھی ہے۔ مساوات کے آج تک کے تمام نظریوں سے بالاتر مساوات۔ وہاں ایک دوسرے کی مدد کے معنی غریبوں اور محتاجوں کو زکوٰۃ دینا نہیں ہوتے کیوں کہ غریبوں اور محتاجوں کا وجود ہی نہیں رہتا وہاں وفاداری کے معنی ہیں پورے سماج کی خاطر اپنی بہترین صلاحیتوں سے بہترین خدمات پیش کرنا۔ وہاں ایمان داری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ محنت کش ایمان داری سے اپنی مزدوری لے کر چپ ہو جائیں۔ اور کچھ لوگ ایمان داری سے اپنا منافع سمیٹتے رہیں — وہاں خوش خلقی کا مفہوم وہ نہیں ہے جو طبقہ داری سماج میں ریاکاری اور

خوش خلقی کا مرکب ہوتا ہے کیوں کہ خوش خلقی کسی مصلحت، مجبوری، خوشامد یا فریب دینے کے لیے نہیں ہوتی۔ عَدل کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ اسے سکّے اور اثر و رسوخ کے داموں خریدا اور بیچا جا سکے۔ سماج میں بنیادی ظلم کا زہریلا سرچشمہ بند ہو جانے سے عَدل ایک عام اخلاقی دستور ہو جاتا ہے اور افراد کے ذہن سے ظلم کی ہیئت اور عَدل کی مہنگائی کا تصور ختم ہوتا ہے۔ وہاں عورتوں کو ملکیت سمجھنے اور ان سے ملکیت جیسا برتاؤ کرنے یا ان کو کمزور جنس بنائے رکھنے کا تصوّر نہیں ہے۔ کیوں کہ سماج میں عورت بھی مَردوں کی طرح آزاد اور خود اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل سے مطمئن سمجھی جاتی ہے۔ مَردوں کی معاشی برتری اور عورتوں کی معاشی اور سماجی بے بسی ختم کر کے اور سماج میں مستند اور غیر مستند ہر طرح پیدا ہونے والی نسلِ انسانی کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے کر کمیونسٹ تحریک نے گھریلو زندگی کی پوری اخلاقیات کو بدل ڈالا ہے۔ اور گھریلو زندگی کی بنیاد اب معاشی مجبوری نہیں رہ گئی بلکہ صرف خوش گوار تعلقات بنیاد بن گئے ہیں۔

صبر و قناعت کے پرانے تصوّر کا کمیونسٹ اخلاقیات میں کہیں وجود نہیں ہے، کیوں کہ اب اس کی تبلیغ کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ کسی شخص کو فاقہ کشی اور تباہ حالی کے ایسے حالات سے نہیں گزرنا پڑتا جن میں اسے قسمت پہ شاکر اور جو کچھ ملا ہے اس پر قانع ہونے کو کہا جائے۔

کمیونسٹ اخلاقیات اگرچہ پچھلی تمام اخلاقیات کی منزلوں سے گزر کر وجود میں آئی ہے لیکن وہ ایک ایسے سماج بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے جس نے

اخلاقیات کے ان تمام اصولوں کو بے معنی بنا دیا ہے جو طبقہ وارانہ سماج کے لئے بنے تھے۔

مثال کے طور پر کمیونسٹ اخلاقیات میں "خیرات" کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے کیوں کہ نہ کسی کو خیرات لینے کی ضرورت رہ جاتی ہے نہ کسی کو خیرات دے کر تسکین حاصل کرنے کی۔ کمیونسٹ اخلاقیات میں "نفس کشی" اور "ترک لذات" کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ کیوں کہ کوئی شخص نہ دوسروں سے عیش چھین کر خود عیاشی کر سکتا ہے اور نہ کسی کو اس حالت پر خاموش رہنے اور "نفس کشی" کی لذت اور ثواب حاصل کرنے کے لئے کہا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح کے وہ اخلاقی اصول جو طبقہ وارانہ سماج کے لئے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے موزوں ہو سکتے تھے اب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اور صرف ان اخلاقی اصولوں کی جگہ رہ جاتی ہے جو بے طبقہ سماج میں رہنے والے عام انسانوں میں محبت، خلوص، پاکیزگی، اتحاد، محنت اور احترام انسانیت کے جذبات کو تقویت بخشیں اور انھیں تر و تازہ رکھیں۔

سوویت روس کا سماج جو اب سوشلزم کی منزل سے گزر کر کمیونزم میں داخل ہو رہا ہے۔ وہاں کے نوجوان طالب علموں کے لئے یہ تصور کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اخلاقیات کے پرانے تصورات میں لوگوں پر اتنی پابندیاں کیوں کر عائد کی جاتی تھیں اور لوگ انھیں برداشت کیسے کر لیتے تھے۔ کسی غیر ملکی ماہر تعلیم نے ایک سوویت اسکول میں جا کر حساب کی کلاس کے طالب علموں سے سوال کیا۔ بچو! بتاؤ اگر میں چار آنے سیر کے حساب سے ۲۸ سیر سیب خریدوں اور انھیں آٹھ آنے سیر بیچوں تو مجھے کیا ملے گا؟ فوراً جواب ملا "چھ مہینے کی سزا۔"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بچوں کے ذہن میں نفع خوری علمِ حساب کا سوال نہیں بلکہ اشتراکی سماج کے اندر اخلاقیات کا سوال بن گیا ہے۔

انسانیت دوستی کے نام سے آج تک جتنے اخلاقیات، جتنے اخلاقی نظریے اور اخلاقی دستور دنیا کے سامنے آئے ہیں، کمیونسٹ اخلاقیات ان سب سے بڑھ کر اور سب سے زیادہ سادہ پاکیزہ اور بے لوث اخلاقیات کا نام ہے کیوں کہ اس کا مقصد ہے غیر طبقاتی سماج کی تعمیر میں مدد دینا۔ اور صحیح معنوں میں مساوی اور آزاد انسانوں کا خوش حال سماج تعمیر کرنا۔ اور وہ ایسے ہی سماج کی پیداوار بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے سماج میں اخلاقیات کو طبقاتی ٹکراؤ چھپانے یا کم کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ پورے سماج کے فلاح و بہبود کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

ٹکراؤ ہے یا نہیں؟

مارکس اور اینگلز کی تحقیق کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کی سماجی تاریخ میں مذہب کی کارکردگی سے جو نتیجے ہمارے سامنے آتے ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ اکثر مذہب کے دو رُخ باقی رہے۔ ایک ترقی پسندی کا دوسرا رجعت پرستی کا۔ ایک سماج کو موجودہ حالت سے آگے لے جانے کے لئے فکری اور اعتقادی طاقت کے طور پر استعمال ہوتا تھا دوسرا سماج کو پرانے بند ھنوں میں جکڑے رکھنے کے لئے حاکم طبقے کے ہتھیار کے طور پر دنیا کے تین بڑے مذاہب جو آج تک باقی ہیں، بدھ مت، مسیحیت اور اسلام۔ تینوں کی مفصل تاریخ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے[1]۔

---

[1] مسیحیت ایک عالم گیر سلطنت کے وقت نمودار ہوئی کہ اس کی کڑی بندشوں کو توڑے اور غلام و آقا کے امتیاز کو کم کرے اور پھر اسی سلطنت نے مسیحیت کو عالم گیر مذہب کے طور پر اختیار کر لیا اور اس سے ایک زمانے تک سوسائٹی کو فیض پہنچتا رہا۔ لیکن بعد میں جب رومن ایمپائر کا زوال شروع ہوا اس وقت سے حاکم طبقے نے مسیحیت کی سب سے قدیم شکل (کیتھولک) کو آج تک غریبوں، محنت کشوں، محکوموں اور دست کاروں کے خلاف استعمال کیا ہے جن کے دل کی وہ صدا تھی۔ اسلام کا بھی یہی حشر ہوا۔ اسلام پھیلنے کے ساتھ ساتھ جو جاگیرداری سماج پھیلا وہ ابتدا میں ترقی کی علامت تھا اور اس سے ایک زمانے تک سماج کو آگے بڑھنے میں مدد ملی۔ بعد میں جاگیردار اور امرا کے طبقوں نے اس سے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے محکوم، غریب، پچھلے ہوئے عوام کے خلاف کام لیا اور آج تک لے رہے ہیں۔

جاگیرداری عہد کی سلطنتوں نے ان مذاہب کی سرپرستی قبول کرلی جو عوام کو ان کے مصائب پر مطمئن اور قانع رکھ سکتے تھے اور طبقاتی سماج کو مشیتِ خداوندی کہہ کر لوگوں کو خاموش کرسکتے تھے۔ فارغ البالی اور اطمینان کے اس طویل عرصہ میں حکمران طبقے نے مذہبی کاروبار کا ایک الگ شعبہ مقرر کیا۔ اسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں پھلنے پھولنے کا پورا موقع دیا۔ سے اپنا حلیف بنایا اور اس کے تمام مصارف سرکاری خزانوں سے دیئے گئے اور جاگیروں کی شکل میں عطا کئے گئے۔

درمیان کی طویل صدیوں میں جنھیں جاگیرداری عہد کہا جاتا ہے سماج کے دبے ہوئے طبقوں اور محکوم آبادیوں نے جب کبھی حاکموں کے خلاف ہاتھ پاؤں نکالے تو انھوں نے اکثر اپنی سیاسی اور سماجی جدوجہد کو نئے مذہبی اعتقادات کا روپ دیا۔ اور پرانے مذہب کے خول میں نئے تصورات ڈال کر ترمیم کردی[1]۔ کبھی یہ ہوا کہ انھوں نے بڑی چھلانگ لگائی اور رائج الوقت مذہب اور سماج کی جڑ بنیاد سے ہی انکار کردیا۔

---

[1] ہندستان میں جین مت نے غیر مادی خالق قوت سے انکار کیا تو بدھ مت نے خالق قوت سے براہِ راست رشتہ قائم کرنے کی تبلیغ کی۔ جین مت نے پرانی دیومالا کو ہی ٹھکرا دیا۔ بدھ مت نے اسی دیومالا میں حسبِ ضرورت ترمیم کرلی اور نئے طریقوں سے اسے اختیار کیا۔ ایران میں مزدک نے زمین کی انفرادی ملکیت سے انکار کیا۔ عورتوں اور غلاموں کے متعلق تمام پرانے قوانین کو منسوخ کردیا اور نئے مذہب اور سماج کی بنا ڈالی۔ عرب میں ابوذر غفاری نے زمین اور چراگاہوں اور باغوں کی انفرادی ملکیت سے انکار کیا۔ معتزلہ نے مذہبی اعتقادات کی غیر عقلی بنیادوں سے انکار کیا۔ حسن بن صباح اور باطنیہ نے عباسیہ سے لڑنے کے لئے شیعیت کی تحریک کو اپنا لیا اور ایران نے عرب اقتدار کے خلاف صف آرا ہونے میں رائج مذہب کی ترمیم شدہ شکل شیعیت کو اختیار کرلیا۔ مسیحیت میں نئے تجارت پیشہ اور کارخانہ دار طبقوں نے کیتھولک عقائد سے انکار کرکے اس کی نسبتاً جمہوری شکل پروٹسٹنٹ مذہب کو جنم دیا اور اس کے بعد محکوم مسیحی عوام نے زیادہ جمہوری چرچ اور زیادہ لبرل مسیحیت میتھڈسٹ عقائد کو اختیار کیا۔

لیکن اگر کبھی سماج کی مادی سطح سے بہت زیادہ آگے بڑھ کر کوئی مذہب دینے یا اصول رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ ناکام رہی۔ کیوں کہ وہ قبل از وقت بھی اور پیداواری طاقتیں اور معاشی ڈھانچہ اس قابل نہ تھا کہ اس انقلابی تصور کو اپنے اندر جذب کر سکتا۔

جب جاگیرداری نظام اپنے عروج کا زمانہ ختم کر چکا اور وہ بھی سماج کو اور آگے بڑھانے کے قابل نہ رہا جو طاقتیں سماج کو آگے بڑھانے والی تھیں، اور خود اقتدار کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان کے مقابلے میں جاگیرداری ساخت کی سلطنتوں نے رائج مذہب کو اپنے ساتھ وابستہ رکھا۔ لہٰذا نئے ابھرنے والے طبقے (بورژوا اور صنعتی آبادی) کو جاگیرداری سلطنت اور اس کے حامی شرفا، امرا اور فوجی افسران کے مقابلے میں کہیں تو مذہب کی تنظیم سے صاف انکار کرنا اور اسے راستے سے ہٹانا پڑا (انقلاب فرانس) اور کہیں مذہب کے پرانے تصورات کے خول میں نئے مذہبی اعتقادات کو جگہ دے کر انھیں عَلَم کرنا پڑا۔ (انگلینڈ کا صنعتی انقلاب)

جس طرح جاگیرداری سلطنتوں میں دبے ہوئے طبقوں کی طرف سے مختلف صورتوں میں مذہب اور حاکم طبقے کے گٹھ جوڑ کے خلاف آواز اٹھتی تھی بورژوا طبقے نے بھی آگے بڑھنے کے لئے نعرہ لگایا کہ سیاست اور مذہب کا کوئی واسطہ نہیں ہے سیاست اور ملکی انتظام کے ادارے یعنی ریاست اور حکومت کو مذہبی اداروں اور اعتقادی معاملات اور مذہبی شعبوں سے الگ ہونا چاہیئے۔ اور جہاں جہاں سائنس کی ترقیوں کا اور جاگیرداری طبقہ وارانہ سماج کا پیدا کیا ہوا بورژوا

طبقہ طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا وہاں اس نے یہی عمل کیا[۵]۔ اور ایسی حکومتیں قائم کیں جنھیں مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس طرح تنظیم یافتہ مذہب (خلافت، رومن کیتھولک ویٹیکن، آرتھوڈکس چرچ وغیرہ) کو جاگیر داری قدامت پسندی کا حامی سمجھ کر اپنے راستے سے ہٹا دیا۔

لیکن وہی سرمایہ داری جب سامراج (شہنشاہیت) کے روپ میں دوسرے ملکوں کی دولت پر چھاپہ مارنے اور نئی زمینوں پہ اپنی فوجی اور تجارتی حکومتوں کا جال پھیلانے نکلی تو اس نے دیکھا کہ پس ماندہ، ناخواندہ اور محکوم ملکوں میں جہاں غیر ملکی طاقت بحال رکھنے کے لئے دوسرے حربوں کی ضرورت ہے وہاں مذہبی تعلیم و تبلیغ بھی کارآمد ثابت ہوگی۔ چناں چہ انگریز، فرانسیسی، پرتگال، بورژوا طبقہ جس نے اپنے یہاں پادریوں کی زمینیں ضبط کی تھیں، اور کلیسا کو شہری قانون کی گرفت میں رکھا تھا۔ دوسرے کمزور ملکوں میں فوجی اقتدار کے سائے میں مذہبی مبلغین کے لئے اور اہنسا اور صلح کل کے پرچار کے لئے بھی سہولتیں مہیا کرتا رہا۔

ایک وقت آیا جب بورژوا صنعت کاری کے سوتے بند ہوگئے اور جاگیرداری اقتدار کی طرح اسے بھی اپنے ہاتھوں سے پیدا کئے ہوئے حالات اور طبقوں کے مقابلے میں زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑے پیمانے کی صنعت کو بڑے پیمانے پر متحد مزدور طبقے کی مانگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ معاشی بحران کی وبا پھیلی۔ بے روزگاری بڑھی، عام لوگوں میں اس کے خلاف بے چینی

---

[۵] "Peasant Revolt in Germany" by F. Engles

بڑھی اور پھر آگے چل کر اپنے اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر سرمایہ دار طاقتوں کو دوسری حریف طاقتوں کا سامنا ہوا اور محکوم ملکوں میں غلام اور نیم غلام باشندوں کی طرف سے تحریک آزادی کی بڑھتی ہوئی لہر کا مقابلہ آپڑا اور پھر ایک بار سماج کی پیدا کی ہوئی طاقتیں حاکم طبقے کے بندھنوں کو توڑنے کے لئے بے تاب ہونے لگیں اور نئے طبقے ابھرنے لگے تو پھر بورژوا طبقے نے اسی منظم مذہب کی امداد لینی چاہی جس کا وہ مخالف تھا اور وہی منظم مذہب جس کی تعلیمات میں روپیہ سمیٹنا، منافع کی خاطر دوسروں سے مشقت لینا اور سود پر روپیہ چلانا ناجائز نہیں تھا۔ اس نے "ایسی ناجائز کمائی" پر جینے والے طبقوں کا ساتھ دیا کیوں کہ پھر ایک بار حاکم طبقہ اور مذہبی اقتدار کے حامیوں کا مفاد ایک ہو گیا تھا۔

ان حالات میں جہاں جہاں سیاسی اور سماجی بیداری عام نہیں تھی اور مزدور طبقہ آبادی کا طاقت ور حصہ نہیں بنا تھا۔ جہاں مزدور طبقے کی باقاعدہ سیاسی تنظیم نہیں تھی وہاں آزادی کی تحریکوں کو بھی مذہبی اعتقادات اور جذبات سے کام لینا پڑا۔ (مثلاً پان اسلامزم، جس کا اہم مقصد یہ تھا کہ مغربی ایشیا کے دبے ہوئے ملکوں سے سامراجی اقتدار ختم کیا جائے) اور جہاں مزدور طبقہ منظم، متحد اور باشعور تھا وہاں اس نے محض اپنی سیاسی اور سماجی جنگ کی طاقت پر بھروسہ کیا اور اسے مذہبی روپ نہیں دیا۔ بلکہ مذہب کو اس کے ماننے والوں کی ذاتی عقیدت مندی پہ چھوڑ دیا (سوشل ڈیماکریٹک پارٹیاں)

مزدور طبقہ جب سماجی مساوات قائم کرنے کے لئے سیاسی اقتدار حاصل کرنے اٹھا اور مزدور تحریک نے صنعتی ملکوں میں زور پکڑا تو مذہبی اقتدار کے حامیوں نے اپنی روایت کے مطابق ان ہی (حاکم) طبقوں کی حمایت کی کہ جو رائج الوقت صورتِ حال کو باقی رکھنا اور سماج کو اپنی مطلب پرستی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا چاہتے تھے اور جب نئے ابھرتے ہوئے محنت کش طبقے نے میدان مارنا شروع کر دیا، انقلابی حالات نظر آنے لگے اور ایک ملک میں اس طبقے نے اپنی حکومت قائم کر لی تو مذہبی اقتدار کے حامیوں نے (بورژوا طبقے کے مفاد کی خاطر) ظالم سے ظالم اور انسانیت کی دشمن طاقتوں کی حمایت کی (فرانکو، مسولینی، ہٹلر، ٹوجو) اور محنت کشوں کی طاقت ور تحریک اور ان کی پہلی ریاست کے خلاف کفر کے فتوے عائد کرنے شروع کر دیئے (مفتیٔ بخارا، پوپ، پنچن لامہ وغیرہ) محنت کشوں کے حقوق اور ان کی ریاست پر جو حملے ہوئے یا ان کا وحشیانہ قتلِ عام ہوا اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔

اور آج یہ حقیقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے کہ تمام سرمایہ دار حکومتوں کے حلقۂ اقتدار میں منظم مذہب کے اکثر بااقتدار رہنما سوویت روس اور چین کے خلاف (انسانیت، اہنسا، اخوت اور عدل کے سارے احکام کو بالائے طاق رکھ کر) عالم گیر جنگ چھیڑنے کے لئے اکساتے ہیں اور کمیونسٹ تحریک یا قومی آزادی کی تحریکوں میں کمیونسٹوں کا ساتھ دینے پر ان مزدوروں کو مذہب سے خارج کرنے اور ذات باہر قرار دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔

جن بے خطا مزدوروں پر گولیاں چلانے والی اور زندگی کی ہر ایک راحت

چھین لینے والی سرمایہ داری اور اجارہ داری حکومتوں کے خلاف، جب تک وہ باقتدار رہیں انھوں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ جو فرمان جاری کرتے یا تبلیغی رسالے اور اخبار شائع کرتے ہیں ان میں اپنے یہاں کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف لوگوں کو منظم ہونے کے لئے نہیں کہتے جس نے خود ان کی مذہبی تعلیمات کو خاک میں ملا دیا ہے اور اخلاقی و سماجی جرائم اور فحاشی، اور حیوانیت کے جراثیم کی پرورش کی ہے بلکہ (چاہے وہ جہوواکی تحریک ہو، گورودوارہ پربندھک کمیٹی ہو، جماعت اسلامی کی تنظیم ہو یا روم کے پوپ کی تبلیغ) کمیونسٹوں کے خلاف، کمیونزم کے خلاف دبے کچلے عوام کی تحریک آزادی میں سب سے آگے بڑھ کر مجاہدانہ شان سے لڑنے والے سپاہیوں کے خلاف دفتر کے دفتر سیاہ کر رہے ہیں اور جھوٹ اور بے بنیاد الزامات کا ایسا طومار پھیلائے ہے ہیں جن کے متعلق خود انھیں صحت کا یقین نہیں ہوتا۔

اب اگر اس پوری سماجی تاریخ کی تصویر میں اور اس کے نتائج کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس سوال کا جواب آسانی سے مل جائے گا کہ کمیونزم اور مذہب میں ٹکراؤ ہے یا نہیں؟۔

ہر ایک مذہب کے دو پہلو یا رُخ ہیں۔

مذہب کا ایک پہلو مابعد الطبیعیات (Mataphysics) کا ہے یعنی غیر مادی قوتوں سے، اعتقادات سے اور ان رسوم سے وابستہ ہے جن کا

تعلق ہر فرد کی ذات سے الگ الگ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اس سے تسکین پاتا ہے کہ ہر اتوار کو چھٹی کا دن عبادات میں گزارے، گرجا جائے، اپنے بچے کو بپتسمہ دلوائے، اپنے مُردوں کا خاص طریقے سے کفن دفن کرائے، دن میں پانچ بار نماز پڑھے، اذان دے، سال میں مہینہ بھر روزے رکھے، گنگا جلی کو مقدس سمجھے، اشنان کرتے وقت خاص اشلوک پڑھے، اپنے بچوں کو ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیم دلوائے۔ گلے میں زنّار ڈالے یا تسبیح پڑھے۔

اپنے اپنے اعتقاد کی بنا پر ایک شخص کو ان مذہبی اعمال سے تسکین ملتی ہے اور اس کی ذہنی یا روحانی راحت ان مذہبی اعمال سے وابستہ ہے۔ یہ آدمی کا ذاتی اور بالکل داخلی اور اعتقادی معاملہ ہے۔ کمیونزم کا نظریہ اور کمیونزم کا عمل چونکہ اپنی طرف سے کسی قسم کے اعتقادات کا کوئی مجموعہ یا رسم اپنے ماننے والوں اور حامیوں پر عائد نہیں کرتا ہے۔ چوں کہ وہ خود ایمان بالغیب اور اس کے رسوم کے سلسلے میں کوئی شرائط نہیں لگاتا ہے۔ کمیونزم چوں کہ کوئی نیا یا پُرانا مذہب نہیں ہے، چونکہ وہ حیات بعد الموت، جنت و دوزخ، نروان اور آواگون، پوجاپاٹ، شریعت و طریقت اور اسی طرح کے دوسرے فقہی مسائل کو کسی نئی یا پرانی شکل میں قطعی پیش نہیں کرتا۔ اس لئے کھلی بات ہے کہ کسی مذہب کے ماننے والوں کے عقائد اور ان کی بجاآوری میں کمیونزم کوئی دخل نہیں دیتا اور نہ اسے ان قصوں سے کوئی واسطہ ہے نہ وہ ان میں اونچ نیچ کا کوئی تصور رکھتا ہے، نہ رکھ سکتا ہے، نہ وہ کسی کو دیتا ہے، نہ کسی کو شہ دیتا ہے اور نہ اسے اس کی ضرورت ہے۔ کمیونزم کے نظریے اور اس کی تنظیم

کے نزدیک یہ اعتقادی معاملات ایسے ہیں جیسے کوئی شخص یہ پسند کرے کہ وہ اپنے بستر پر چیت سوئے اور کوئی شخص داہنی کروٹ سے، کوئی بائیں پہلو سے، کوئی شخص تخت پر فرش کرکے آرام پاتا ہے، کسی کو نرم بستر پر سونے میں راحت محسوس ہوتی ہے۔ ایک آدمی اپنے لباس کی کوئی تراش پسند کرتا ہے دوسرا شخص کوئی اور بلکہ اس سے بالکل مختلف۔ ظاہر ہے کہ کمیونزم کے نظریے کو کمیونسٹ پارٹی کو اور اس کی رہنمائی میں جو ریاست قائم ہوتی ہے اس کو ان معاملات سے سروکار نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ سوویت روس میں کسی شخص کے نام، مقام اور پتے کے سلسلے میں کسی جگہ اور کسی سرکاری ادارے میں یہ ریکارڈ نہیں رکھا جاتا کہ کون مسلمان ہے، کون مسیحی، کون بدھ ہے اور کون یہودی۔ کسی فارم میں اس طرح کے خانے بنانا اور اس بنا پر شہریوں سے امتیاز برتنا قانوناً جرم ہے۔ ہاں مذہبی اداروں کو اس کی اجازت ہے (واضح رہے کہ سرمایہ داری نظام کے ملکوں کے اندر سرکاری اداروں میں، رجسٹروں میں، مردم شماری میں اور دوسرے موقعوں پر اس قسم کی تمیز کی جاتی ہے اور بعض ملکوں میں تو اسی بنا پر حقوق دیئے یا چھینے جاتے ہیں اور لوگوں کے مذہبی عقائد کی بنا پر ان کے شہری حقوق کو بھی نقصان پہنچایا جاتا ہے)

مذہب کا دوسرا پہلو سماجی طریقِ زندگی کا ہے اور یہی زیادہ اہم ہے کیونکہ مذہب کے ساتھ صرف اعتقادات ہی وابستہ نہیں رہے ہیں بلکہ ہر زمانے میں سماج کا ایک خاص ڈھچر اور خاص دستور بھی مذہب کے تصور،

سے وابستہ رہا ہے۔

جہاں تک اس سماجی طریق زندگی کا تعلق ہے اس کے متعلق دو تصور ہمیشہ سے چلے آتے ہیں۔ ایک تصور حاکم طبقوں کا اور دوسرا محکوم طبقوں کا۔ ایک زرداروں کا، دوسرا ناداروں کا۔ ایک عام بھولے بھالے سادہ لوح لوگوں کا تصور اور دوسرا ان ہوشیار اور مکار گروہوں کا جو "شکر کی لذت میں نقد حیات" لوٹ لیتے ہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ یہ دو تصور مختلف مذاہب کے بارے میں نہیں بلکہ اکثر ایک ہی مذہب کے بارے میں ہوتے ہیں اور ایک ہی زمانہ میں ہوتے ہیں

ایک عام ہندو باشندہ جو چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہاتا ہے اور صبح سے شام تک زندہ رہنے کی کوشش میں اپنی ہڈیاں تک چٹخاتا ہے اس کا نظریہ ہندو مذہب کے بارے میں کیا ہے؟ یہ کہ وہ اسے پاکیزگی، جسمانی اور روحانی پاکیزگی بخشتا ہے۔ اپنے مخالفوں کو برداشت کرنا سکھاتا ہے۔ اپنے ہمسایوں، ہم وطنوں اور ہم پیشہ لوگوں سے محبت کی تعلیم دیتا ہے، کسی جاندار کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرنے سے روکتا ہے، بے قصور لوگوں کو ایذا پہنچانے سے روکتا ہے، مذہبی تیوہاروں کے ذریعے ایک دوسرے کے گلے ملنے، خوش رہنے اور خوشی تقسیم کرنے اور بھائی چارہ بڑھانے کے موقعے عطا کرتا ہے نا انصافی اور جبر کے خلاف متحدہ طور پر صف آرا ہونے کی تعلیم دیتا ہے وغیرہ۔ لیکن ایک اجارہ دار اور حاکم طبقے کے فرد برلا اور ڈالمیا کے نزدیک (جو خود بھی سرمایہ داروں کی دو مخالف صفوں سے تعلق رکھتے ہیں) ہندوازم کا تصور

اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے نزدیک ہندوازم کی افادیت یہ ہے کہ وہ ان کے محکوم اور ان کی لوٹ کے شکار ہندو ملازموں اور غریبوں کو صبر و رضا کی تعلیم دیتا ہے۔ انھیں سکھاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں جو تم ایمان داری سے محنت مشقت کرتے ہو اس کا اچھا پھل اگلے جنم میں پاؤ گے۔ وہ ان غریبوں اور عام لوگوں کو سکھاتا ہے کہ برلا اور ڈالمیا بھی تمھارے بھائی ہیں۔ تمھارے لئے مندر بنواتے ہیں۔ پجاریوں کو وظیفہ دیتے ہیں۔ دھرم کی سیوا کرتے ہیں اور تمھارے ہندو مذہب کا نام اونچا کرتے ہیں۔ وہ طبقاتی دوری اور مذہب کے ٹکراؤ پر ایک پردہ ڈال دیتا ہے۔ ان کے خلاف عوام کے غصے کو بجھانے میں کام آتا ہے۔ ان اجارہ داروں کے نزدیک ہندو دھرم کے معنی یہ ہیں کہ ہندو عوام میں فرقہ پرستی کی لہر دوڑانے کے لئے اور نیم فاشسٹ جماعتوں کی فوجی تیاریوں اور جنگی ارادوں کی رگوں میں خون دوڑانے کے لئے اسے بڑی بڑی رقمیں دی جائیں۔ ان رقموں سے بے قصور لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے ہتھیار خریدے جائیں۔ نسلی منافرت کا پرچار کیا جائے اور اہنسا کے پرچارک گاندھی جی کے سینے پر انھی رقموں سے خریدی ہوئی گولیاں داغ دی جائیں۔ رائے بہادر مودی کے نزدیک ہندو دھرم کا تصوّر یہ ہے کہ ایک طرف تو (مودی نگر میں) کیک پیسٹری بنانے والے کارخانے میں مزدوروں کے منھ پر کام کے گھنٹوں میں موٹی موٹی پٹیاں باندھی جائیں کہ وہ کہیں دو بادام منھ میں نہ ڈال لیں۔ دوسری طرف ویدوں اور پرانوں کی تعلیم کے لئے سالانہ ایک رقم مخصوص کر دی جائے جس سے ہندو عوام انھیں

اپنا خیر خواہ سمجھ کر دھوکا کھائیں۔

اسی طرح ایک عام مسیحی محنت پیشہ اور ملازم پیشہ آدمی کے نزدیک مسیحیت کا تصور یہ ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی مذہب ہے جو نسل، رنگ، زبان اور قومیت کی حدوں کو جن میں انسانیت بٹی ہوئی ہے توڑ کر دنیا کے ہر ایک مسیحی کو ایک برادری کے رشتے میں جوڑ دیتا ہے وہ ہمسائے سے محبت کرنا سکھاتا ہے وہ ہر ضرورت مند کی خدمت کرنا سکھاتا ہے۔ وہ روپیہ اور منافع کی خاطر لین دین کے لالچ سے روکتا ہے۔ وہ ظلم سے روکتا ہے، حق قرابت ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے وہ فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے میں روکتا ہے وہ عورتوں اور ماتحتوں کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور دُنیا میں امن و امان چاہتا ہے اور سب انسانوں کو مسیح کے ساتھ خدا کا وارث اور نائب قرار دیتا ہے۔

لیکن ایک مسیحی بادشاہ اور جاگیردار کے نزدیک مسیحیت کا تصور یہ ہے کہ وہ زمین کے موجودہ قوانین کی پابندی کرنا اور بادشاہ کی تعظیم کرنا سکھاتا ہے وہ کہتا ہے کہ "جو چیز سیزر کی ہے وہ سیزر کو دے دو۔" وہ لوگوں کو اس بات پر رضامند کر لیتا ہے کہ "اگر تمھارے ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ اگر کوئی کوٹ اتارے تو پیراہن بھی اتار کر اس کے حوالے کر دو۔" جو لوگ آسمان سے آئے ہوئے اس ضابطے کے خلاف شک کریں یا مُرتد ہو جائیں تو کلیسا کا حق ہی نہیں بلکہ فرض ہے کہ وہ انھیں قتل کر دے (چنانچہ میکیب نے خود کلیسائی حلقوں میں تحقیقات

کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ صرف ۱۸۲۰ء سے ۱۸۷۰ء کے پچاس سال کے دوران چار لاکھ نہتے مردوں، عورتوں اور بچوں کو مختلف طریقوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا صرف اس جُرم میں کہ وہ جمہوری خیالات رکھتے تھے۔ حالانکہ یہ بے چارے بادشاہوں اور کلیساؤں کو مٹانے کے بھی درپے نہیں تھے)

بالکل ایسے ہی ایک عام مسلمان اپنے مذہب کے متعلق کیا تصوّر رکھتا ہے؛ یہ کہ اس کا مذہب اس میں انسانیت دوستی کے جذبات پیدا کرتا ہے وہ دشمنوں پر رحم کرنا سکھاتا ہے، وہ عورتوں، یتیموں، قرابت داروں اور مسافروں کے ساتھ بھلائی اور ایثار کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ وہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کو ایک برادری شمار کرتا ہے اور اس میں غلام و آقا، افسر اور ماتحت کی کوئی تمیز نہیں کرتا۔ ان کو ایک صف میں کھڑا کرتا ہے۔ وہ ان میں اخوّت کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جس کے اعمال نیک ہوں وہ قابلِ عزت ہے، وہ انصاف، احسان اور صداقت کی تعلیم دیتا ہے اور اس کی عملی مثالیں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ "(جو لوگ سونا چاندی سمیٹ کر رکھتے ہیں اور اسے خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان سے کہہ دو کہ دردناک عذاب ان کا انتظار کر رہا ہے) عام مسلمان کے لئے اسلام خدا کا بتایا ہوا راستہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ سود لینا حرام ہے، سود دینا حرام۔ بلیک مارکیٹ حرام۔ ہورڈنگ (ذخیرہ اندوزی) یا احتکار حرام۔ لیکن مرحوم امیر بخارا، ابن سعود، حسن البنّا، شورہ بازار کے علما اور جاگیردار

کے تنخواہ یاب مفتیوں کے نزدیک، سلاطین کے نزدیک اور میر عثمان علی خاں کے نزدیک اسلام کا تصور اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے نزدیک اسلام وہ ہے جو زمین کو انفرادی ملکیت مانتا ہے، جو خیرات دینے کے بعد ہر قسم کے لُوٹے کھسوٹے ہوئے روپے کو جائز کر دیتا ہے۔ جو توبہ و استغفار کرنے پر ظالموں اور استحصال کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔ قحط بنگال کے زمانے میں احتکار (ہورڈنگ یا ذخیرہ اندوزی) کرنے والے اصفہانی کے نزدیک اسلام کا تصور یہ ہے کہ مسلم لیگ کو چند لاکھ روپے چندہ دینے اور خیراتی کاموں میں تھوڑی سی رقم دینے کے بعد وہ انھیں دُنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو کر دیتا ہے۔ وہ غریب اور تباہ حال مسلمان کو یہ کہہ کر چپ کر دیتا ہے کہ "الدُّنیا سِجنُ لِلمؤمِنِ والجنّۃ للکافِر"۔ (دُنیا صاحب ایمان لوگوں کے لئے قید ہے اور بے ایمان لوگوں کے لئے عیش کی جگہ ہے) جن لوگوں سے ان کے پیدائشی حقوق سرمایہ داری و جاگیرداری کی لُوٹ کھسوٹ میں چھین لئے ہیں ان کو سمجھا دیتا ہے کہ تم صبر سے کام لو۔ تمھارا اجر اللہ پر ہے وہ ادا کرے گا۔ اور یہ کہ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ وَبِیَدِکَ الْخَیْر (خدا جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے، خیر اسی کے ہاتھ میں ہے) اس طرح سے طبقاتی لوٹ، جبر و ظلم اور نا انصافی کے اصلی اسباب کی پردہ پوشی کر لیتا ہے اور مسلم جاگیردار، سرمایہ دار، مہاجن اور چور بیوپاری کو یہ تسکینِ قلب عطا کرتا ہے کہ وہ صرف کلمہ پڑھ دینے اور مذہبی اداروں کو معمولی خیرات دینے یا روپیہ دے کر نمازیں پڑھوانے اور حج کرانے سے دنیا میں عزت بھی پائے گا اور آخرت میں جنت کے محلوں پر بھی قبضہ کر کے بیٹھ جائے گا۔

مذہب کے جو سماجی برتاؤ کا پہلو ہے اور جو زیادہ اہم پہلو ہے اس میں یہ دو تصور ہمیشہ سے رہے ہیں اور جہاں جہاں مذہب کا اثر باقی ہے وہاں آج تک چلے آرہے ہیں۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کے بارے میں ایک طرف تو عوام کا تصور ہے اور دوسری طرف خواص کا۔ ایک طرف تمام وہ لوگ ہیں جو سوسائٹی کی بے محابا طاقتوں اور ظلم کی چکی کے تلے پس رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو انھیں پیس رہے ہیں۔ ایک طرف تمام محنت پیشہ طبقے ہیں اور دوسری طرف تمام مفت خور گروہ اور ان کے ایجنٹ اور وظیفہ خوار ہیں۔ ایک طرف کھیت مزدور ہے، ہریجن ہے، غریب کسان ہے، شہری مزدور ہے، چھوٹا بیوپاری ہے۔ ملازمت پیشہ لوگ ہیں، سفید پوش درمیانی درجے کے لوگ ہیں، مندروں اور مسجدوں اور کلیساؤں میں عبادت کرنے اور عبادت کرانے والے غریب پادری، موذن اور پجاری ہیں اور بھولے بھالے خدا ترس، دین دار عوام ہیں اور دوسری طرف ان سب کی محنتوں پر عیش سے بسر کرنے والے سلاطین، جاگیردار، امرا، متولی اور بڑے بڑے سرمایہ دار اور ان کے مجاور۔

جب مذہب کے اس دوسرے پہلو کا سماجی طریق زندگی اور سماجی عمل کا سوال آتا ہے تو یقیناً کمیونزم ان دونوں تصوروں کے درمیان فرق کرتا ہے وہ محنت پیشہ عوام کے مذہبی تصور کو نفرت یا حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ اس کا احترام کرتا ہے اور عوام کی محنت اور نادانی کے ذریعے خود عیش کرنے والے طبقوں کا جو دوسرا تصور ہے اس سے کمیونزم کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ کمیونزم ایک سماجی تحریک ہے وہ سماج میں نہ تو ایسے طبقوں کے وجود سے صلح کر سکتی ہے

جو عام لوگوں سے زندگی کی مادی اور روحانی برکتیں چھین لیں۔ قدرت اور سائنس کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے دُنیا کی بہت بڑی آبادی کو محروم رکھیں، ان میں جہالت افلاس، پستی، بیماری، بے روزگاری اور نسلی، تہذیبی اور قومی نفرت کا زہر پھیلائیں اور نہ وہ اس تصوّر کو پوری آزادی اور سہولت دے سکتی ہے جو تصوّر، ان کی اس سماجی لوٹ اور جبر کو جائز قرار دینے کے لئے نئے نئے روپ دھار کر آتا ہے۔

کمیونزم کا ٹکراؤ مذہب کے سماجی پہلو میں اس تصوّر سے نہیں ہوتا، جو اپنی روٹی میں سے آدھا ٹکڑا اپنے ہمسائے کو یا دوست کو یا مہمان کو یا مذہبی اداروں کو دینا چاہتا ہے لیکن کمیونزم کا ٹکراؤ اس تصوّر سے ضرور ہوتا ہے جو بڑا مندر بنوا کر یہ سمجھتا ہے کہ اب مذہبی نقطۂ نظر سے لوٹ جائز ہو گئی ہے کمیونزم اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

کمیونزم کا ٹکراؤ مذہب کے سماجی پہلو میں اس دوسرے تصوّر سے ضرور ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ تصوّر وہ ہے جو مذہب کو "عوام کے لئے افیم" کی طرح استعمال کرتا ہے جو عوام کو فریب دینے اور سماج کو پستی میں اٹائے رکھنے کے لئے کام آتا ہے۔

کمیونزم کا ٹکراؤ مذہب کے سماجی پہلو میں پہلے تصوّر سے نہیں ہوتا جو عوام کا تصوّر ہے۔ کمیونزم کا ٹکراؤ ہرگز اس مذہب سے نہیں ہوتا جو عام محنت پیشہ اور ناداروں اور متوسط طبقے کے ایمان دار لوگوں کا مذہب ہے۔ کیوں کہ بے بس عوام چاہے وہ کسی عقیدے کے حامی کیوں نہ ہوں ایک ایسی

زندگی چاہتے ہیں جس زندگی میں وہ نہ بے ایمانی کرنے پر مجبور رہوں نہ بے ایمانی کا شکار رہوں۔ ہر ایک مذہب کے ماننے والے عام لوگ ایسا سماج چاہتے ہیں جس میں وہ خود بھی خوش حال ہوں، ان کا ہمسایہ بھی خوش حال ہو۔ ایک ایسا سماج چاہتے ہیں جس میں نہ وہ خود چوری کریں اور نہ کوئی دوسرا ان کے یہاں چوری کرنے پر مجبور رہو۔ جس میں نہ وہ خود دوسروں کا حق ماریں نہ کوئی دوسرا شخص ان کا حق مارنے کی ترغیب پائے۔ ایک ایسا سماج جہاں سے وہ تمام اخلاقی برائیاں دور ہو جائیں جو اُن کے تصور کے مطابق گناہ ہیں اور جو اُن کی آخرت بگاڑنے والی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بے طبقہ سماج میں اور اس کی طرف بڑھنے والی راہوں میں ہی ممکن ہے۔ کمیونزم یہی کہتا ہے اور یہی راہ دکھاتا ہے۔

عوام نے ہر دور میں چاہے وہ عہدِ غلامی ہو، عہدِ جاگیرداری ہو، یا عہدِ سرمایہ داری، اپنی پکار بلند کی ہے اور اکثر ان کے مذہبی تصورات کے ساتھ یہ پکار سُنی گئی ہے لیکن حاکم طبقوں کا مذہبی تصور ہمیشہ سے بہرہ رہا ہے۔ مزدک سے لے کر گورو نانک تک اور دستن سے جمال الدین افغانی تک ہر ایک نے چیخ چیخ کر اپنے زمانے کے حاکم طبقوں سے پوچھا ہے:۔

ظالمو! تم نے مذہب کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ یہ کون سا مذہب ہے جس نے تمھیں ظلم اور عدوان کی پوری اجازت دے رکھی ہے؟ یہ کون سا مذہب ہے جو ہمیں صبر و رضا سکھاتا ہے اور تمھیں حرص و ہوس؟ یہ کون سا مذہب ہے جو ہمیں ایثار سکھاتا ہے اور تمھیں لوٹ؟ جو ہمیں اخوت اور محنت کشی سکھاتا ہے

اور تمھیں منافرت اور عیاشی؛ تمھارا مذہب وہ ہے جس نے قدرت کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو فتنہ و فساد کا سبب بنا دیا ہے، اور عیال اللہ پر زندگی جہنم کر دی ہے۔

یہ چیخ ہر عہد میں بلند ہوئی اور اکثر اسے بے رحمی سے دبا دیا گیا یہاں تک کہ عہدِ سرمایہ داری نے اپنے بدترین زوال کی بیسویں صدی میں پہنچ کر ہر اس امکان کو خاک میں ملا دیا جو عوام کے مذہبی تصور اور عام انسانیت دوستی کے جذبات کو روشنی دکھا سکتا تھا۔ سماجی پہلو سے عوام کا مذہبی تصور وہ ہے جو انسانیت دوستی کی آغوش میں پلا ہے اور جو زندگی کو ہرا بھرا دیکھنا چاہتا ہے اور جو انسان کو خوش حال مطمئن، فکرِ فردا سے بے نیاز دیکھنے کا تمنائی ہے۔ لیکن مذہب کے بارے میں عوام کا تصور آج تک محض خواب رہا ہے۔ کمیونزم ایسا سماج تعمیر کرنا چاہتا ہے جو اس خواب کی تعبیر دے سکے۔ اور انسانیت دوستی کے سارے چشمے کھول سکے۔ انسانیت کے دشمنوں کو راستے سے ہٹانے کے لئے کمیونزم کی آواز عوام کی چیخ نہیں رہ گئی ہے بلکہ تلوار کی جھنکار بن چکی ہے۔

مذہبی آزادی

بعض لوگ ایمان داری سے اس طرح سوچتے ہیں کہ کمیونزم کی تحریک چوں کہ خود ان معنوں میں مذہب نہیں ہے جن میں دوسرے مذاہب آج تک ہوئے ہیں۔ چوں کہ وہ خود کسی مذہبی عقیدے کی حامی یا مخالف نہیں ہے اور اس میں خدا کی پرستش کا اور دوسرے اسی قسم کے عقائد کا وجود نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ وہ مذاہب کے ساتھ مخالفانہ سلوک کرتی ہو۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ دنیا کے ایک ایک گوشے سے ان مذہبی لیڈروں نے کمیونزم پر کفر کے فتوے لگائے جن کو سرمایہ داری اور جاگیرداری حکومتوں کے سائے میں اونچے اونچے مقام حاصل تھے۔

کچھ لوگ دوسری طرح سوچتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جس طرح ایک مذہب نے اقتدار حاصل کر کے دوسرے مذہب والوں پر جبر کیا ہے جس طرح بڑے بڑے بادشاہوں اور فوجی سپہ سالاروں کے زمانے میں اقتدار کی جنگ کرتے ہوئے ایک مذہب والوں نے دوسرے مذہب والوں کا

بے دردی سے خون بہایا ہے اور صرف عقائد کے اختلاف کی بنا پر انھیں ظلم کا نشانہ بنایا ہے اسی طرح ممکن ہے کہ کمیونزم بھی جس کا نظام ہر ایک مذہب سے جداگانہ ہے، تمام مذاہب کے ساتھ زیادتی اور جبر کا برتاؤ کرے۔

اس شبہ کا جواب، جہاں تک صرف نظریے کا تعلق ہے۔ ہماری اب تک کی بحث سے مل جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کا تجربہ انھیں بتاتا ہے کہ مختلف تحریکوں کے قول اور عمل میں اکثر فرق بھی ہوتا ہے۔ کتابوں اور بیانوں میں کچھ اور لکھا ہوتا ہے اور عمل کی صورت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں ہم نظریے کی عملی صورت پیش کرتے ہیں۔

کیوں کہ کمیونزم اب کوئی ایسی تحریک نہیں رہ گئی ہے جس کے ہاتھ میں کتاب اور زبان پر محض تبلیغ ہو۔ آج ہمیں یہ ثابت کرنے کی سہولت ہو گئی ہے کہ کمیونزم کا قول اور اس کا عمل دراصل ایک ہی معنی کے دو لفظ ہیں۔ آج کمیونزم کی تحریک ایک تہائی دُنیا کو اپنے سجھائے ہوئے راستے پر لے جا رہی اور اس ایک تہائی دنیا کی قسمت بنانے کی پوری قوت مزدور طبقے اور اس کی رہنما کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا اس ایک تہائی دنیا کے سماجی حالات کو دیکھ کر کمیونزم کے قول اور عمل کا ایک ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں جب سرمایہ دارانہ صنعت کاری جوش پر تھی، اس وقت ایسا ادب پیدا ہوا اور ایسی تحریکیں چلیں جنھوں نے ہر اس نشان پر بے دردی سے حملہ کیا جس کا تعلق جاگیرداروں سے یا ان کے حامی مذہبی اداروں سے تھا۔ یہ ردِّ عمل تھا جاگیرداری نظام اور مذہبی اداروں کی

مشترکہ زیادتیوں کا۔ اور ردِّ عمل بھی اتنا ہی بے درد تھا۔

فرانس اور جرمنی خاص طور سے ایسی تحریکوں کے اور ایسے ادب کے مرکز تھے۔ بعض انجمنیں بن گئی تھیں جنھوں نے اپنا بنیادی مقصد ہی مذہب کی مخالفت اور اس سے جنگ کرنا قرار دے لیا تھا۔ درمیانی طبقے کے پڑھے لکھے جوانوں میں خاص طور سے اس قسم کی تحریکیں زور پکڑتی رہیں۔ لیکن "کمیونسٹ مینی فیسٹو" کے مصنفوں نے خود کو عملی طور پر ایسی تحریکوں سے الگ رکھا۔

۱۸۷۴ء میں انقلابی نعرہ لگانے والے بعض لوگوں نے جو لندن میں جلا وطن ہو کر پہنچے تھے، مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور اسے اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ تو اینگلز نے کہا کہ اس طرح سے مذہب کے خلاف جنگ کرنے کو مزدوروں کا سیاسی مقصد قرار دینا ایک نراجی طریقہ ہے جو بالکل بے ہودہ ہے۔

جرمن فلسفی ڈوہرنگ، جس نے اشتراکی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا تھا اس کے خلاف کڑی تنقید کرتے ہوئے فریڈرک اینگلز نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان لوگوں کے منھ پر طمانچہ ہے جو کمیونسٹوں کو الزام دیتے ہیں۔ ڈوہرنگ نے اپنی کتاب "فلاسفی" میں لکھا تھا۔

> "آگے چل کر جو ریاست (میرے بتائے ہوئے اصول کے مطابق) بنے گی اس کے آئین میں یہ بھی شامل ہے کہ آزاد سماج میں کسی قسم کا کوئی مذہبی گروہ یا مذہبی ادارہ نہ ہوگا۔ کیوں کہ آزاد سماج کے ہر فرد کو اس بچپکانہ وہم پرستی سے بلند ہونا ہے کہ فطرت کے پس پردہ یا

اس کے اوپر کوئی ایسا وجود بھی ہے جسے عبادت کر کے یا قربانی پیش کر کے متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اشتراکی انداز کے اس سماج کو چاہیئے کہ وہ مذہبی شعبدہ بازی کے پورے تام جھام کو بالکل مٹا دے اور اس طرح سے مذہبی فرقوں، گروہوں اور اداروں کے سارے ضروری اجزا بالکل ختم کر دئے جائیں۔"

اینگلز نے اس بیان کو بے معنی اور لچر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:-

"یہ حد سے گزر جانے اور آپے سے باہر ہونے کی دلیل ہے۔ ڈہرنگ سوچتا ہے کہ اپنی پیش کی ہوئی "اشتراکی" ریاست میں مذہب پر فوج دوڑا دے گا اور زبردستی سے اس کو "شہید" کر ڈالے گا۔ یہ عجب اشتراکیت ہے جس پر حملہ آورانہ فوجی ذہنیت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔"

۱۸۸۳ء میں مارکس کے بتائے ہوئے اصولوں پر روس میں پہلی انجمن قائم ہوئی۔ "مزدوروں کی نجات" اس نے جو پروگرام پیش کیا اس میں صاف لفظوں میں بتایا گیا کہ "ضمیر کی آزادی ہونی چاہیئے۔" اور اس معاملے میں تمام باشندوں سے ایک برتاؤ کیا جائے "چاہے وہ کسی مذہب کو مانتے ہوں۔ اور چاہے وہ کسی نسل سے ہوں۔"

۱۸۷۵ء میں اشتراکی مزدوروں کی پارٹی کی طرف سے جو تاریخی پروگرام "گوتھا پروگرام" شائع کیا گیا اس میں جہاں یہ مطالبہ رکھا گیا تھا کہ چرچ (کلیسا) کو ریاست سے اور تعلیم کو چرچ سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔

دہیں یہ بھی جتایا گیا کہ " مذہب کو ایک ذاتی معاملہ سمجھا جائے "۔ (جب اس کا مفہوم موقع پرست لوگوں نے غلط نکالا تو مارکس نے اس پر سخت تنقید کی)

اینگلز نے " مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھنے " کے اصول کی یوں وضاحت کی تھی کہ جتنے مذاہب ہیں ان میں سے کسی کو سرکاری مذہب قرار نہ دیا جائے۔ سرکار کی نظر میں سب کی پرائیویٹ حیثیت ہونی چاہیئے۔ اور تمام مذہبی اداروں کو اسٹیٹ کی طرف سے پرائیویٹ ادارے سمجھا جانا چاہیئے۔ پبلک کی تعلیم پر مذہبی اداروں کی نگرانی نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ یہ ہر مذہب کے ماننے والوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ چاہیں تو اپنے چندوں سے ان اداروں کو چلائیں۔

۱۹۰۵ء میں (جب روس کے اندر انقلابی پارہ تیزی سے چڑھ رہا تھا) لینن نے مذہب کے سوال پر ایک مضمون لکھتے ہوئے اس کے متعلق بالشویکوں کے نظریہ کی وضاحت کی ہے کہ:۔

> " سرکار کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ مذہبی انجمنیں اور جماعتیں اسٹیٹ سے بندھی ہوئی نہ ہوں۔ ہر شخص کو اس بات کی پوری اور قطعی آزادی ہو کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے اور چاہے تو لامذہب ہو جائے ..... مذہبی وجوہات سے ملک کے باشندوں کے حقوق میں کسی قسم کی کوئی اونچ نیچ نہ برتی جائے۔ یہاں تک کہ سرکاری کاغذات میں جو لوگوں کا مذہب اور اس کی تشریح کی جاتی ہے وہ بھی نہ کی جائے۔ مذہبی جماعتوں کو سرکاری خزانوں سے

رقم نہ دی جائے بلکہ چندے دینا یا مالی امداد کرنا اس مذہب کے
ماننے والوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔"

روس میں پہلے یہ نہیں ہوتا تھا بلکہ مذہب کے نام پر ہر قسم کا ظلم روا رکھا جاتا تھا۔ آرتھوڈکس (قدامت پسند) چرچ سرکاری مذہب تھا اور اسے تمام دوسرے مذاہب پر برتری حاصل تھی۔ مسیحی مبلغین کو سرکاری جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ انھیں عام اجازت تھی بلکہ سرکاری سرپرستی حاصل تھی کہ وہ چاہیں تو دوسرے مذاہب کے لوگوں کا مذہب بدلوا کر انھیں اپنے حلقے میں شامل کر لیں۔ لیکن کسی دوسرے مذہب کے مولویوں، سادھوؤں اور لاماؤں کو ایسا کرنے کی اجازت نہ تھی۔

مذہبی قتل عام ہوا کرتے تھے، کسی سیاسی سوال کو مذہبی[1] رنگ دے کر لوگوں کی توجہ ادھر پھیر دی جاتی تھی۔ آرتھوڈکس چرچ کے ماننے والوں کے علاوہ دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ زیادتیاں کی جاتی تھیں۔ کئی بار یہودیوں کے خلاف فساد کی آگ بھڑکائی گئی۔ کئی مرتبہ ازبک مسلمانوں اور تاجک مسلمانوں کو مذہبی غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔ اور کبھی ازبک اور قازق مسلمانوں سے بدھوں پر حملے کرائے گئے۔ یہ سلسلہ اشتراکی انقلاب کے فتح پانے تک جاری رہا۔ اور جب بالشویکوں نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ ان کی نظر میں تمام مذاہب برابر ہیں۔ ان میں سے کسی کی سرکاری حیثیت نہیں ہے سب کو برابر کے حقوق حاصل ہیں تو بالشویک پارٹی اور اس کی

---

[1] یہ کیوں کر ہوتا ہوگا۔ ہندستان اور پاکستان کے لوگ اس کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں اور پورا اندازہ کر سکتے ہیں۔

حکومت کے خلاف آرتھوڈکس چرچ نے جہاں یہ شور مچایا کہ وہ مذہبوں کے ساتھ زیادتی کر رہی ہے، وہاں یہ بھی کہا کہ اس کا بڑا جرم یہ ہے کہ "اس نے لامذہبوں کو، بدعتیوں کو، مسلمانوں کو، یہودیوں کو برداشت کر رکھا ہے

کمیونسٹوں نے اختیارات سنبھالتے ہی پہلا جو اعلان کیا اس میں ضمیر کی آزادی، مذہب کی آزادی، ایمان، اعتقاد، تہذیب اور زبان کی آزادی کا کھلا حکم نافذ کر دیا۔ لینن نے بالشویک انقلاب ۱۹۱۷ کی کامیابی کے چند روز بعد ہی دبی ہوئی قومیتوں اور مذہبوں کو اپنی ایک تقریر میں خطاب کرتے ہوئے کہا۔ تاتارو، ترکمانو، قفقازیو اور تمام محکوم قومو! آج سے تمہاری گردن پر رکھا ہوا بوجھ ہٹا لیا گیا ہے۔ تم ضمیر، مذہب اور تہذیب میں آزاد ہو، اس کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۱۸ کو سوویت حکومت نے باقاعدہ ایک فرمان شائع کیا جس میں اعلان کیا گیا تھا:

"سوویت جمہوریہ کے پورے علاقے میں کہیں کسی مقام پر بھی ایسا حکم، ایسا ضابطہ یا ایسا قانون جاری کرنا منع ہے جس سے ضمیر کی آزادی پر چوٹ پڑتی ہو یا مذہبی عقیدے کی بنا پر لوگوں کے کسی حصے کو دوسروں سے زیادہ رعائتیں یا حقوق دیئے جائیں۔ ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے۔ نہ چاہے تو نہ مانے۔ کسی خاص مذہب کو ماننے یا کسی مذہب کو نہ ماننے کی وجہ سے جو پابندیاں تھیں وہ سب ختم کی جاتی ہیں۔

کسی سرکاری تقریب کے موقعہ پر مذہبی رسمیں ادا نہیں کی جائیں گی۔[1]
مذہبی رسمیں ادا کرنے یا تقریب منانے کا حق ہر ایک مذہب والوں کو حاصل ہے لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ اس سے پبلک کے امن وامان اور انتظام میں خلل نہ پڑے۔ اور دوسرے لوگوں کے حقوق کو نقصان نہ پہنچے۔
مذہبی طور پر حلف اٹھانے کا (سرکاری) دستور ختم کیا گیا۔ اور اس کی جگہ صرف "ایمان داری سے عہد کرتا ہوں" کہنا کافی قرار دیا گیا۔

اس فرمان کی رُو سے مولویوں، پادریوں، لاماؤں، سادھوؤں اور راہبوں کو سب کے برابر شہری حقوق دئے گئے۔ یہ ضرور ہوا کہ جس طرح کہ دوسرے جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط کی گئی تھیں۔ چرچ کی بڑی بڑی جاگیریں بھی اشتراکی ملکیت بنادی گئیں۔ اور اس طرح سے ایک مذہب پر دوسرے مذہب کا اقتدار ختم کرکے مذہبی اعمال کی پوری آزادی دے دی گئی۔

یہی نہیں، بلکہ لینن نے خود اس بات کی اجازت دی کہ جو علماء، یا مفتی یا پادری یا دوسرے مذہبی گروہ بالشویک پارٹی میں نیک نیتی کے ساتھ شامل ہونا چاہیں انھیں شامل کیا جائے۔ نیک نیتی کا مقصد یہ کہ وہ پارٹی کے پروگرام کو مانتے ہوں اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔

مختلف نسلوں، قوموں اور مذہبوں کے ساتھ رواداری اور مکمل غیر جانب داری کا اندازہ اس سے لیا جا سکتا ہے کہ جب ملک کا نیا آئین

---

[1] یہ کتنا انقلابی فرمان اور کتنا غیر جانب دارانہ رویہ تھا اس کا اندازہ ہندستان کے لوگ کر سکتے ہیں جہاں سرکاری تقریبوں اور افتتاحوں کے موقعہ پر غیر مذہبی سرکار خود مذہبی رسمیں ادا کرتی ہے۔

بنا اور اس کا نام رکھنے کا سوال درپیش ہوا تو خود لینن اور دوسرے بالشویک لیڈروں نے باتفاق فیصلہ کیا کہ آج سے ہم اپنے ملک کا نام بدل دیتے ہیں اور روس کا نام خارج کرتے ہیں کیوں کہ "روسی" قوم کے اقتدار نے دبے ہوئے فرقوں اور مذہبوں کو ماضی میں اپنے ماتحت رکھا تھا اور انھیں اس لفظ سے ایک مخصوص نسل، فرقے اور مذہب کی بو آتی تھی۔ چناں چہ پورے ملک کا نام "یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس" رکھا گیا اور ہزاروں برس پرانا لفظ "روس" خارج کر دیا گیا۔

سوویت روس میں زیادہ تر چار مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ سب سے بڑی تعداد روس کے قدیم آرتھوڈکس چرچ کے ماننے والوں کی ہے۔ اس کے بعد مسلمان۔ ان سے کم بدھ مت کے ماننے والے اور پھر یہودی۔ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی بستے ہیں لیکن بہت کم۔ البتہ ان چار مذاہب کے ماننے والے اس طرح سے آباد چلے آرہے ہیں کہ ان کے علاقے یکجا ہو گئے ہیں۔

اسٹالین نے قوموں کے سوال کو مارکسی تصور کے مطابق حل کرنے کے لئے جو "حق خود اختیاری" کا فارمولا تیار کیا اس نے دنیا میں پہلی بار مذہبی، تہذیبی، لسانی، قومی اور وطنی آزادی کی ایسی مثال قائم کی جس کا تاریخ میں کہیں بھی وجود نہیں تھا۔

"حقِ خود اختیاری" کے اصول نے ہر ایک قومیت کو اس بات کی پوری

آزادی دے دی کہ اس کا ایک قومی علاقہ ہوگا۔ جس میں اس کی اپنی زبان ذریعۂ تعلیم ہوگی، اس کی تہذیبی روائتیں برقرار اور آزاد رہیں گی۔ اسے پھلنے پھولنے کا پورا موقعہ ملے گا۔ وہ اپنی قومی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے ترقی کر سکے گی۔ اسے مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور پورا حق ہوگا کہ وہ جب چاہے یونین سے الگ ہو جائے۔

بعد میں جو آئین پورے ملک کے لئے نافذ ہوا اس میں قوموں کے اس "حق خود اختیاری" کو مان لیا گیا۔ جس کی وجہ سے ہر قوم کو اپنی اندرونی آزادی کی پوری گارنٹی مل گئی اور گارنٹی ملنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویت دیس قوموں کا ایسا خاندان بن گیا جس خاندان میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے اور برادرانہ تعاون اور بھائی چارے کی بنیاد پر سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

۹ ستمبر ۱۹۲۷ء کو استالین نے امریکی نمائندوں سے ملاقات کے دوران میں بتایا کہ:۔

> "ہمارا قانون تمام شہریوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہیں مانیں۔ یہ ہر آدمی کے اپنے ضمیر کا معاملہ ہے۔ اور اسی لئے ہم نے کلیسا کو ریاست سے الگ کر دیا ہے۔ لیکن کلیسا (مذہب) کو ریاست (حکومت) سے الگ کر کے اور مذہبی آزادی دے کر ہم نے ہر ایک شہری کا یہ حق بھی محفوظ کر دیا ہے کہ وہ دلیل، بحث، استدلال، پروپیگنڈے اور ایجی ٹیشن کے ذریعے جس مذہب کی چاہے مخالفت کر سکتا ہے اور چاہے تو تمام مذہبوں کو رد کر سکتا ہے۔"

سوویت روس میں مذہبی ادارے باقی ہیں۔ مسجدیں، گرجا اور شوالے باقی ہیں۔ ان میں اذانیں اور نمازیں ہوتی ہیں۔ پوجا پاٹ ہوتی ہے۔ ان کے تیوہار ہوتے ہیں۔ لوگ چندے دیتے ہیں جن سے پجاریوں اور موذنوں، اماموں وغیرہ کا خرچ چلتا ہے۔ مذہبی احکام اور کتابیں اور رسالے شائع ہوتے ہیں کھلے بندوں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ تبلیغ ہوتی ہے۔ پیدائش، موت، نکاح اور طلاق وغیرہ کے لئے سرکاری رجسٹری کے دفتر موجود ہیں، لیکن اگر کوئی شخص چاہے تو وہ مفتیوں سے فتوے لے سکتا ہے۔ مذہبی احکام کے مطابق یہ تمام رسوم ادا کر سکتا ہے۔ وہ اپنے بچے کو بپتسمہ دلوا سکتا ہے۔ نکاح کے صیغے پڑھوا سکتا ہے، یہ اس کی اپنی مرضی پر ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی پارٹیاں بن سکتی ہیں اور وہ سیاسی معاملات میں حصہ لے سکتی ہیں۔ مذہب کی بنیاد پر سیاسی پارٹیاں یا گروپ بنانا خلافِ قانون ہے۔ نہ مذہبی بنیاد پر امیدوار کھڑے کر کے الیکشن لڑنا ممکن ہے۔ مذہبی جماعتوں اور اداروں کو صرف مذہبی معاملات کے دائرے میں رہنے کی آزادی ہے۔ اس کی وجہ سے مذہبی بنیادوں پر گروہ بندی کرنا ختم ہو گیا ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں، اسکولوں میں اور پبلک اداروں میں کسی شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اپنا مذہب بتانے پر مجبور کرے اور نہ کسی شخص سے اس کا مذہب دریافت کیا جاتا ہے اور نہ آج تک اس طرح کی سرکاری رپورٹ یا مردم شماری کی رپورٹ تیار

ہوئی ہے جس میں یہ لکھا، یا بتایا گیا ہو کہ مختلف علاقوں میں یا پورے ملک میں فلاں مذہب کے ماننے والے اتنے ہیں اور فلاں مذہب کے اتنے۔

اس عمل کی بدولت اقلیت اور اکثریت کا امتیاز مٹ گیا ہے۔ مذہبی فرقہ بندی کے نقصانات کا خاتمہ ہو گیا ہے اور ضمیر و مذہب کی پوری آزادی قائم ہو گئی ہے۔

سوویت روس میں ہر ایک مذہب کے ماننے والوں کو آزادی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے تیوہار منائیں۔ اپنی مذہبی رسمیں ادا کریں، جلسے کریں، مجالس منعقد کریں، آئین کی دفعہ ۱۲۴ کی رُو سے یہ تمام حقوق مانے گئے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں جب "استالین آئین" کے خاکے پر پورے ملک میں بحث چل رہی تھی، ایک جانب سے دفعہ ۱۲۴ میں ترمیم پیش کی گئی۔ ترمیم چاہنے والوں کا کہنا تھا کہ مذہبی رسوم ادا کرنے پر کچھ نہ کچھ پابندی لگائی جائے۔ اس کے جواب میں کامریڈ استالین نے کہا:-

> "مذہبی رسمیں ادا کرنے کو خلاف قانون قرار دینے کے لئے جو ترمیم پیش کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے نامنظور کر دیا جائے کیوں کہ وہ آئین کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔"

چناں چہ وہ ترمیم نامنظور ہو گئی۔

اب نہ صرف یہ کہ مذہبی ادارے موجود ہیں بلکہ ان کی سرگرمیاں مذہبی لوگوں کی خواہش کے مطابق آزاد ہیں۔ جب کوئی بلاتا ہے تو پادری اس کے گھر جاتے ہیں، بچے کو بپتسمہ دیتے ہیں۔ مذہبی دعائیں پڑھتے ہیں۔ تجہیز و تکفین

مذہبی احکام کے مطابق کرتے ہیں۔ مسلمان روزے رکھتے ہیں اور روزہ داروں کو رمضان کے مہینے میں کام کی سہولت دی جاتی ہے۔ جانوروں کی قربانی ہوتی ہے۔ قربانی کا گوشت تقسیم ہوتا ہے۔ عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں بڑے اجتماع ہوتے ہیں۔ ایسٹر کی چھٹیاں ہوتی ہیں اور ان چھٹیوں کے موقعہ پر گرجاؤں میں حسبِ دستور کیک لائے جاتے ہیں۔ لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہوتے ہیں۔ لوگ مذہبی تیوہاروں اور خاص موقعوں پر سڑکوں اور بازاروں میں ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔

چوں کہ سرکاری اسکولوں میں دینیات کی تعلیم نہیں دی جاتی اس لئے مذہبی لوگوں کو اپنے دینی اسکول قائم کرنے کی پوری اجازت ہے چناں چہ ایسے دینی اسکول ہر ایک علاقے میں موجود ہیں۔ مذہبی جماعتیں اپنے طور پر دینیات کی تعلیم کے اسکول قائم کئے ہوئے ہیں۔ آرتھوڈکس چرچ کے ماننے والے کیتھولک مسیحیت کے ماننے والے مسلمان، آرمینی، شیعہ، سُنّی سب الگ الگ اپنے پرائیویٹ مدرسوں میں دینیات کی تعلیم کا انتظام رکھتے ہیں۔ ان کی انتظامی سوسائٹیوں کی طرف سے دینیات کے رسالے، پمفلیٹ، کتابچے، کلینڈر، اور ماہانہ اخبار شائع ہوتے ہیں جو منگانے والوں کو بھیجے جاتے ہیں نہ کسی شخص کو دینیات کی تعلیم لینے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے دینیات کی تعلیم سے روکا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے تو ٹیوٹر یا معلم رکھ کر بھی دینیات کی تعلیم دلا سکتا ہے۔

مذہبی اداروں اور جماعتوں کی صورت یہ ہے کہ جہاں کہیں کسی مذہب

کے کم از کم ۲۰ بالغ و عاقل ماننے والے موجود ہوں وہ مل کر سوسائٹی بنا سکتے ہیں اگر ان کے پاس مسجد یا گرجا یا خانقاہ اور شوالہ نہ ہو تو اسٹیٹ کی طرف سے وہ مہیا کر دی جاتی ہے اور اس کی تمام ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔ مثلاً چٹائیاں، فرش، بنچیں، منبر، قالین، فانوس۔ جہاں یہ عمارتیں کسی دوسرے ذریعے سے مہیا نہ ہوں وہاں ان کی تعمیر کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ مذہبی جماعتوں کو اپنا کام چلانے کے لئے دوکانیں رکھنے کی، موٹر وغیرہ رکھنا اور موم بتیاں، اگر بتیاں، پھول، ہار، کیاریاں، باغات، چھوٹی کاشت کاریاں رکھنے کی اور اسی طرح کا دوسرا ضروری سامان باقی رکھنے کی قانونی طور پر اجازت ہے۔ کبھی کبھی خود اسٹیٹ کی طرف سے اس کا انتظام کرنے میں سہولت دی جاتی ہے اور اس کے لئے دو محکمے باقاعدہ موجود ہیں جن کو ایک طرف وزارت میں جگہ ملی ہوئی ہے، دوسری طرف مذہبی جماعتوں سے بھی ان کا واسطہ رہتا ہے۔

سارے ملک میں مذہبی بورڈ موجود ہیں۔ مذہبی معاملات اور ادارے اور عمارتیں انہی کے تحت رہتی ہیں۔ یہ مذہبی بورڈ غیر سرکاری ہوتے ہیں۔

روس اور جارجیا کے آرتھوڈکس چرچ کو ماننے والے سب سے زیادہ ہیں۔ ماسکو میں ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ان کی شاخیں دنیا کے دوسرے ملکوں مثلاً امریکہ، فرانس، چین، جرمنی میں بھی موجود ہیں۔ بعض کے نمائندے ماسکو میں رہتے ہیں۔ پورے ملک میں بیس ہزار سے زیادہ چرچ قائم ہیں۔ جن میں باقاعدہ عبادت ہوتی ہے۔ ان کے اعلیٰ پادری کا انتخاب ہوتا ہے

ان کے سب سے بڑے پادری الکشیس ۱۹۴۵ء میں یروشلم زیارت کرنے گئے تھے اور یہ روس کی تاریخ میں پہلا موقعہ تھا جو کہ روس کے آرتھوڈکس چرچ کا پادری یروشلم میں زیارات ادا کرنے گیا۔ حالاں کہ پچھلے مذہبی بادشاہوں کے زمانے میں کبھی اس کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

اسی طرح مسلمان علمار سینکڑوں کی تعداد میں ہر سال حج کرنے جاتے ہیں مسلمانوں کا نظام مذہبی علاحدہ ہے۔ ان کے یہاں مُلّا ہوتے ہیں اور محتسب جنھیں خود اسلام کے ماننے والے مقرر کرتے ہیں اور اسلامی بورڈ کے فنڈ سے ان کو تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ جہاں نمازی ہوتے ہیں مگر مسجد نہیں ہوتی وہاں مسجدیں بنائی جاتی ہیں، مدرسے کھولے جاتے ہیں۔ جہاں تفسیر، حدیث اور فقہ کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ ایسے چار مذہبی بورڈ جنھیں دینی مجلس کہتے ہیں اس وقت موجود ہیں۔ یورپی علاقے اور سائبیریا میں رہنے والے مسلمانوں کی ایک مجلس ہے جس کا صدر مقام یوفا میں ہے اور کمیونسٹوں کے طاقت میں آنے سے پہلے صرف یہ ایک مجلس قائم تھی۔ اب اس کے صدر شیخ الاسلام خالدنوف کے صاحب زادے مفتی حافظ کلیم اللہ شاکر ہیں۔ دوسری مجلس وسطِ ایشیا اور قزاقستان کی ہے جس کا صدر مقام تاشقند میں موجود ہے اور اس کے صدر مفتی احسان باباخان ابن عبدالمجید خاں ہیں جو ایک بزرگ عالم ہیں۔ تیسرا بورڈ یا مجلس کاکیشیا پار کے مسلمانوں کی ہے جس کا دفتر باکو میں ہے۔ اس کے رہنما شیخ الاسلام علی زادے آخوند آغا جواد ادعلی ہیں۔ چوتھی مجلس داغستان کی ہے، جس کے صدر مفتی محمد قاضی بن قربان ہیں۔ ان تمام علمار اماموں اور رہنماؤں کا

چناؤ صرف مسلمانوں کی کھلی کانفرنسوں میں رائے شماری سے ہوتا ہے۔ یہ چار ڈل بورڈ اپنے اپنے علاقوں کے مطابق بنے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کا مذہبی نظام انھی کے ماتحت ہے۔ تازان میں علومِ اسلامیہ کا ایک زبردست دارالعلوم موجود ہے۔ جہاں باہر کے طالب علم بھی پڑھنے آتے ہیں اور ان کے مصارف کے لئے مسلمانوں کے چندے سے وقف قائم ہے۔ ایک امریکن سیاح جو جنگ کے زمانے میں وہاں گیا تھا اس کا بیان ہے کہ میں نے وہاں خوش حالی اور تروتازگی دیکھی۔

جنگ کے بعد ۴۵ء میں مفتیٔ اعظم باعیسیٰ بابکان کی قیادت میں ایک ہزار کے قریب علماء اور مسلمانوں کا قافلہ حج کرنے گیا تھا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی معاشی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں حج کرنے جاسکتے۔

یہودیوں کا کوئی مذہبی مرکز تو نہیں ہے لیکن ایک خودمختار علاقہ بروبجان ہے جس میں یہودی النسل لوگوں کی آبادی زیادہ ہے۔ ان کے اخبار نکلتے ہیں۔ عبرانی زبان میں تعلیم ہوتی ہے۔ (پچھلے دو ہزار سال میں پہلی بار سوویت کی سرزمین تھی جس نے یہودی قومیت کو سر چھپانے کا ٹھکانا اور پوری قومی آزادی عطا کی)

اسی طرح بدھ مت والوں کی آبادی زیادہ تر منگولیا کی جمہوریت میں ہے۔ وہاں ان کا مذہبی بورڈ موجود ہے جس کے تحت راہبوں کی خانقاہیں اپنا کام کرتی ہیں۔ پجاری اور پجارنیں مذہبی طرز کی زندگی گزارتی ہیں۔

رومن کیتھولک چرچ، آرمینائی چرچ، لوتھر کے ماننے والے اور دوسرے

مسیحی مذہب بھی موجود ہیں۔ ان کی الگ الگ عبادت گاہیں، الگ بورڈ اور علاحدہ انتظامات ہیں، لیکن دوسرے چھوٹے اور بڑے مذاہب کے برابر۔

مذہبی آزادی کا صحیح مفہوم اگر پورا ہوتا ہے تو ان ملکوں میں جہاں طبقاتی نابرابری کے ساتھ مذہبی نابرابری کو بھی ختم کیا جا رہا ہے اور مذہب کی بنیاد پر کسی شخص سے کوئی امتیازی برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ اس لحاظ سے سوویت روس دُنیا کا پہلا ملک ہے جس نے مذہبی آزادی کا صحیح مفہوم عملی شکل میں پیش کیا۔ ورنہ درمیانی عہد کی طویل صدیوں میں جب مذہب اور ریاست ایک دوسرے سے وابستہ تھے، مذہبی اختلاف ایک عذاب تھا۔ صرف مذہبی اختلاف کی بنا پر یا اقتدار مذہبی گروہ دوسرے مذاہب کے ساتھ تذلیل اور تحقیر کا برتاؤ کرتے تھے۔ جن ملکوں اور جن زمانوں میں مذہبی تحقیر اور اونچ نیچ کو کم کرنے کی کوشش کی گئی وہاں بھی تمام مذہبوں کو یکساں حیثیت کبھی حاصل نہیں ہوئی اور مذہب کی مروجہ شکلوں کو نہ ماننے والوں کے ساتھ تو وہ ظالمانہ برتاؤ کیا گیا ہے جو درندوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔

سوویت روس کے خلاف، بالشویکوں اور ان کے ساتھ ساری دُنیا کے کمیونسٹوں کے خلاف یہ بھرپور پروپیگنڈا ہوا ہے کہ وہ مذہب کو بزورِ قوت مٹاتے ہیں، یہ پروپیگنڈا ہر ملک میں وہاں کے مذہبی رجحان کے

مطابق کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اتنا مشتعل کر دیا جائے کہ وہ اصل تحریک کو سمجھنے سے گریز کریں۔ اس پروپیگنڈے کی بنیاد اگرچہ محض جھوٹ اور فریب پر ہے لیکن اس کی لپیٹ میں ایک حقیقت بھی موجود ہے۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ روس میں، اور پورے یورپ میں کمیونسٹ تحریک کو جہاں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے اپنے لئے خطرہ سمجھا وہیں منظم چرچ، جو خود بڑا جاگیردار تھا، اسے بھی اپنے اقتدار کے لئے یہ خطرہ نظر آیا۔ اسی طرح مذہبی اداروں کے متولّیوں نے دیکھا، کہ اگر کمیونسٹ تحریک فتح یاب ہوتی ہے تو اوقاف اور ان کی بدولت جو اقتدار قائم ہے اس کا خاتمہ ہوگا چنانچہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ زردار طبقوں کا ساتھ دیا بلکہ کمیونسٹ تحریک اور مزدوروں کے اندولن کے مقابلے پر اُتر آئے۔ انھوں نے صرف پروپیگنڈے پر بس نہیں کی بلکہ عملی مقابلہ بھی کیا۔ اور کھلم کھلا محنت کش طبقے کے مخالفوں کا ساتھ دیا گرجاؤں، مسجدوں اور خانقاہوں کو مخالف سرگرمیوں کا اڈہ بنایا اور انقلاب کی کامیابی کے بعد تک ان میں سے اکثر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا مشن پورا کرتے رہے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی پسند عوام ان سے مشتعل ہوئے اور عوام کے غصّے کا کوہِ آتش فشاں جب پھٹا ہے تو ایسے لوگ اور ایسے ادارے بھی لپیٹ میں آئے جنھوں نے مذہبی لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ جس چنگاری کو وہ ہاتھوں سے مسل دینا چاہتے تھے وہ چنگاری مسلی نہیں گئی بلکہ شعلہ بن گئی اور پھر ان لوگوں نے جبّہ و دستار سنبھال کر راہِ فرار اختیار کی اور

اپنے ساتھ بعض بھولے اور سادہ دل لوگوں کو بھی بہکا کر لے گئے جنھیں بالشویک انقلاب کے دشمنوں نے ہر اُس ملک میں بکھیر دیا جہاں مذہب کے سوال پر کمیونسٹوں کے خلاف پروپیگنڈا کرانا تھا۔

لیکن جب ایک بار انقلاب کامیاب ہو گیا۔ اس کے قدم جم گئے اور تعمیر شروع ہوئی تو مذہب کے ساتھ بھی رواداری نہ برتاؤ کیا گیا اور لوگوں کے مذہبی مطالبے مانے گئے۔

مذہبی گروہوں میں کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا مخالف اور جانی دشمن پاپائے روم تھا جس نے انقلاب کے زمانے میں مغربی یورپ کے سرمایہ دار ملکوں میں اپنے حامیوں سے کہا کہ وہ مل کر سوویت روس پر حملہ کر دیں۔ لیکن انقلاب کی کامیابی کے بعد فوراً (۱۹۱۷ء) پاپائے روم کے سفیر لینن کے پاس پہنچے اور انھوں نے مذہبی صورت حال کے متعلق دریافت کیا تو لینن نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں مذہبی معاملات کی پوری آزادی ہے۔ اور یہ آزادی آپ کے لئے بھی ہے۔ کیتھولک مورخوں کا بیان ہے کہ اس زمانے میں بہت سے پادری وہاں گئے اور روس کی تاریخ میں پہلی بار یہ واقعہ ہوا کہ ۱۹۱۸ء میں روس کے شہروں میں "کورپس کرسٹی" کا سالانہ جلوس نکلا اور امن وامان کے ساتھ نکلا۔

رومن کیتھولک عیسائیت کے ماننے والے زیادہ تر پولینڈ کے لوگ تھے جب پولینڈ کی حکومت نے برطانیہ، فرانس، امریکہ، جاپان، چیکوسلاویکیہ وغیرہ کی حکومتوں سے مل کر اور "سفید سپاہیوں" کی طرف سے بالشویکوں پر

دھاوا بولا ہے تو بظاہر آثار ایسے تھے کہ پولینڈ کی فوج فتح پا جائے گی اس نازک وقت میں روم کے بھیجے ہوئے کیتھولک پادری دشمن سے مل گئے اور انھوں نے بالشویکوں کے خلاف مذہبی بھیس میں سرگرمی شروع کر دی۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک جو وطن کے بچاؤ کی جنگ لڑی گئی اس دوران میں کئی کیتھولک پادریوں پر جاسوسی کا شبہ ہوا، ان پر مقدمہ چلا اور انھیں سزائیں دی گئیں۔

۱۹۱۹ء میں جہاں پولینڈ کی فوجوں کو شکست ہوئی اُنھی کے ساتھ پولش پادری بھی نکالے گئے۔ لیکن بعد میں جنیوا کے لاٹ پادری پوپ کے نمائندے کی حیثیت سے بالشویک لیڈر کامریڈ چچرن سے ملنے گئے اور اس ملاقات کے بعد صفائی ہو گئی۔ کیتھولک پادریوں کو پھر سے روس میں داخل ہونے کی اجازت بھی مل گئی۔

۱۹۲۲ء تک پاپائے روم اور بالشویک لیڈروں کے تعلقات اچھے رہے قحط کے زمانے میں ایک امریکی پادری کی سرکردگی میں پاپائے روم کی طرف سے ایک مشن بھیجا گیا۔ یہ مشن اس شرط پر بھیجا گیا تھا کہ سوائے اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے کوئی اور حرکت نہیں کرے گا۔ لیکن اس نے وعدے کی پابندی نہیں کی اور مذہبی تبلیغ اور قحط زدہ لوگوں کی امداد کرنے کے بجائے اس نے مخالف سیاسی پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۴ء میں پھر ان کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا اور وہ سوویت روس سے باہر کر دیے گئے۔

۱۹۲۴ء ۱۹۲۵ء میں تقریباً یہی صورت قفقاز میں پیش آئی۔ امیر

بخارا خود تو کابل پہنچ گئے اور شاہِ افغانستان کے مہمان ہو گئے۔ لیکن بخارا تاشقند اور سرحدی علاقوں میں انھوں نے اپنے جاسوس مذہبی لباس میں چھوڑ دیے۔ جو فوجی مقابلوں کی تیاری کراتے رہے۔ جن کا بالآخر اپنے انجام کو پہنچنا لازمی تھا۔

یہ صورتِ حال بہت عرصے تک جاری رہنے والی نہیں تھی۔ انقلاب کا پودا جب بارآور ہوا اور سادہ دل عوام نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اُن کی مذہبی آزادی کو بالشویک انقلاب اور پرولتاری ڈکٹیٹرشپ سے کوئی خطرہ نہیں ہے تو وہ خود ہی ان لوگوں کے مخالف ہو گئے جو انھیں مذہب کے نام پر بہکانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

چنانچہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں نازیوں نے پھر ایک بار یہی اوچھا ہتھیار استعمال کرنا چاہا تھا۔ انھوں نے پادریوں اور چرچ کے خادموں کی شکل میں اپنے جاسوس اور اسکاؤٹ بھیجے۔ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں پر صلیب کے نشان بنائے۔ ہوائی جہازوں سے دستی اشتہار پھینکے جن میں لوگوں سے کہا گیا کہ وہ کمیونسٹوں کی لامذہب حکومت کو شکست دینے میں ان کا ساتھ دیں[1]۔ جہاں جہاں نازیوں کا قبضہ ہوا تھا وہاں انھوں نے گرجاؤں میں اپنے نام کے خطبے پڑھوائے اور غیر کمیونسٹ نظامِ حکومت کی تعریف کرائی۔ لیکن اس کے باوجود عوام کا پچیس سال کا تجربہ ایک طرف اور

---

[1] یہ وہی نازی تھے جنھوں نے ہزارہا یہودیوں کو غیر نسلی اور غیر مذہب کہہ کر گرفتار، قتل اور جلاوطن کیا تھا۔

نازیوں کی درندگی اور ان کے مظالم دوسری طرف، انھیں یہ سکھانے کو کافی تھے کہ کمیونسٹ نظام سے بڑھ کر کوئی اور سماجی نظام انسان کو ضمیر کی آزادی اور اعتقاد کی آزادی نہیں دے سکتا۔

یہی وجہ تھی کہ نازیوں کو شکست دینے میں قفقاز کے مسلمان اور جارجیا کے آرتھوڈاکس عیسائی، آرمینیا کے مسیحی، کیتھولک، یہودی اور بدھ، سب ایک دوسرے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے ایک دل ہو کر دشمن کے دانت کھٹے کر دئے۔

اس کا سبب تھا دراصل اشتراکی سماج کی اندرونی ساخت۔ اس میں قوموں کا حق خود اختیاری اور لوگوں کو ضمیر، مذہب اور اعتقاد کی آزادی جس کے معتبر گواہ سوویت روس کے اندر بھی موجود ہیں اور سوویت روس سے باہر بھی۔

اکتوبر ۱۹۵۰ء میں پورے سوویت روس کی جو امن کانفرنس ہوئی اس میں تقریر کرتے ہوئے لتھونیا کے کیتھولک پادری نے کہا۔

"سوویت یونین نے اور عوامی جمہوریتوں نے زندگی کو ایسے قالب میں ڈھال لیا ہے کہ عوام کے درمیان آپس کے تعلقات اور بیوپار میں نہ تو زبان کا فرق حائل رہ گیا ہے نہ نسل کا اور نہ مذہب کا اختلاف۔"

مسیحی فرقے ایون جلیکل کرسچین کی کل یونین کے صدر نے ایک مضمون میں لکھا:۔

"انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء کی اہمیت ہم مذہبی لوگوں کے لئے یہ ہے کہ

اس نے تمام مذہبی جماعتوں کو آزادی بخش دی ہے...... مذہبی لوگ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرتے ہیں اور انھیں اپنے ایمان کے مطابق مذہبی احکام بجالانے کی پوری آزادی ہے...."

کاکیشیا پار کے مسلمانوں کے مذہبی بورڈ کے صدر شیخ الاسلام حلّی زادے نے جولائی ۱۹۵۱ء میں پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ:-

"انقلاب سے پہلے ہمارے ملک میں مسلمانوں پر مذہبی مظالم ہوا کرتے تھے اور اب سوویت یونین میں تمام مذہبوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں اور استالین کے آئین نے مکمل مذہبی آزادی کی گارنٹی دی ہے سوویت حکومت کے سائے میں مسلمانوں نے تعلیم اور اعلا تہذیب کا لذیذ پھل چکھا ہے۔ عام مسلمان کسانوں اور مزدوروں کے بیٹے بیٹیاں سرکاری انتظامات کے عہدے سنبھال رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اور وزارتیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ کارخانوں کے ڈائرکٹر ہیں اور سائنسی اداروں میں اعلا انتظامی عہدوں پر مامور ہیں

آرتھوڈکس چرچ کے کل روس کے اعلا پادری اسرجئیس نے اب سے دس برس پہلے مذہبی آزادی کے متعلق لکھا تھا کہ:-

"سوویت حکومت نے ضمیر کی اور مذہبی عبادات کی آزادی کے متعلق جو فرمان جاری کیا ہے اس نے چرچ پر سے وہ بوجھ ہٹا لیا جس کے تلے وہ برسوں سے دبا ہوا تھا۔ اس نے چرچ کو باہر کی سرپرستی سے آزاد کر دیا۔ اس نے چرچ کی اندرونی زندگی کو بڑا فائدہ پہنچایا

اس فرمان نے آزادی عطا کی اور اس بات کی گارنٹی دی کہ تمام
مذہبوں کی آزادی محفوظ ہے اس پر کسی قسم کی دخل اندازی نہیں
کی جا سکتی . . . . .‘‘

جب دوسری جنگِ عظیم چھڑی اس وقت یہی میٹروپولٹن سرجیس تھا جس نے پہلے دن اعلان کیا کہ ہم اس جنگ میں مسیحی اعتقاد اور ضمیر کی پوری قوت کے ساتھ وطن کی حفاظت کریں گے۔

لینن گراڈ جب چاروں طرف سے نوسو دنوں تک دشمن کے نرغے میں گھرا رہا اس وقت مسیحی پادری الکشیس خود بھی لینن گراڈ کے اندر ثابت قدمی کے ساتھ رہا۔ اس نے گرجاؤں میں دعائیں منگوائیں اور لوگوں سے کہا کہ وہ دشمن سے جنگ کرنے کے لئے خدا سے توفیق مانگیں اور اس کو تمام آرتھوڈکس مسیحیوں کا مذہبی فریضہ قرار دیا۔

۸ ر جولائی ۱۹۵۱ء کو برطانیہ کے ایک مسیحی فرقے (کوئیکرز) کا ایک وفد مسیحی راہبوں کی خانقاہیں اور گرجائیں دیکھنے کے لئے دورہ کرتا رہا اور اس نے اپنے بیان میں اقرار کیا کہ سوویت کے اندر مذہبی آزادی دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے۔

حال ہی میں تمام دنیا سے آرتھوڈکس چرچ کے نمائندے اور دوسرے مسیحی فرقوں کے نمائندے سوویت یونین گئے۔ ان میں سکندریہ، قسطنطنیہ، یروشلم اور یارک کے بڑے بڑے پادری شامل تھے۔ انھوں نے بے روک ٹوک ہر جگہ گرجاؤں کو جا کر دیکھا اور جاتے وقت زبانی اور تحریری بیان میں سوویت یونین

کے اندر مذہبی آزادی کی بڑی تعریف کی۔

مئی ۱۹۵۱ء میں برطانوی مزدوروں کا ایک وفد سوویت یونین میں آیا تھا۔ اس نے لندن جاکر جو اپنا بیان شائع کرایا اس میں لکھا تھا:-

"مذہب بالکل آزاد ہے۔ مذہبی رسوم ادا کرنے پر کسی کو سزا نہیں دی جاتی۔ ان کو بھی آزادی ہے جو مذہب کو نہیں مانتے۔ مذہبی عبادتیں نہایت خلوص اور وقار کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ استالین گراڈ میں دو گرجا جنگ کے زمانے میں تباہ ہو گئے تھے وہ پھر سے بنا دئے گئے۔"

وفد کے ایک ممبر جان وِلسن نے اپنے بیان میں کہا۔

"جب بیپٹسٹ گرجا میں گیا تو پادری نے مجھے بتایا کہ حکومت کی طرف سے ہمارے مذہب میں کوئی دخل اندازی نہیں ہوتی۔ انجیل کی تعلیم دینے اور تبلیغ کرنے میں ہمیں پوری آزادی ہے۔ جب میں نے پوچھا۔ اس عقیدے کے کتنے لوگ یہاں ہوں گے؟ تو اس نے بتایا کہ پانچ لاکھ کے قریب۔ اور بہت سے چرچ بھی موجود ہیں۔"

جولائی میں امریکہ کی ٹریڈ یونین کا ایک وفد سوویت روس گیا اور اس نے دورہ کرنے کے بعد اپنے خیالات ان لفظوں میں لکھے۔

"ہر شہر میں ہمیں مکمل مذہبی آزادی نظر آئی۔ جس شہر میں ہم گئے، ہم نے دیکھا کہ چرچ بھی موجود ہیں اور لوگ بھی ان میں آتے جاتے ہیں ماسکو میں ہمارے کئی رومن کیتھولک ممبر دو اتواروں تک رومن

کیتھولک گرجا میں گئے۔ اور انھوں نے دیکھا کہ وہی لوگ جو پچھلے اتوار کو عبادت میں مصروف تھے وہی اس بار بھی موجود تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہمیشہ سے اسی طرح ماسکو کے چرچ میں آتے رہے ہیں اور پابندی سے آتے رہے ہیں۔ کبھی کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہودی خانقاہوں کو مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہے۔"

ابھی چند روز ہوئے ۹ رمئی ۵۲ء سے ۱۲ رمئی ۵۲ء تک ماسکو میں سوویت یونین کے تمام مذہبی اداروں اور انجمنوں کے نمائندے امن عالم کے سوال پر بحث کرنے جمع ہوئے تھے اور انھوں نے مشترکہ دستخطوں سے امن عالم قائم رکھنے کے لئے اپنے اپنے ہم مذہبوں سے ایک عام اپیل کی تھی۔

اس کانفرنس کے موقعے پر سائبیریا اور یورپی علاقے کی مشترکہ مسلم دینی مجلس کے صدر شیخ الاسلام خالدنوف کے صاحب زادے مفتی الحافظ کلیم اللہ شاکر نے کہا۔ "ہماری مسلم دینی مجلس ۱۶۲ سال سے قائم ہے۔ لیکن اس کی تاریخ کے دو دور ہیں پہلا دور انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء تک۔ اور دوسرا اس کے بعد سے ہمارے وقتوں تک زارشاہی روس میں صرف عیسائی مذہب کے ماننے والوں کو رعایتیں حاصل تھیں اور مسلمانوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی جاتی تھی انھیں بھی دوسری اقلیتوں کی طرح حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کا عظیم انقلاب ہمارے عوام کے لئے، اقلیتوں کے لئے اور مسلمانوں کے لئے مسرت وراحت کا پیغام بن کر آیا۔ کیوں کہ اب آئین کے مطابق چرچ کو ریاست سے اور اسکول کو

چرچ (کلیسائی نظام) سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اب سوویت یونین میں کسی مذہب کو خاص رعایتیں یا امتیازی حقوق حاصل نہیں ہیں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ برابر کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اور تمام لوگوں کو اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہے"۔

پہلی مئی ۱۹۵۱ء کو زگورسک میں علماء کی امن کانفرنس ہوئی تھی اس موقع پر موصوف نے کہا تھا۔ "...... ہمارے بچے سوویت یونین کی دوسری قوموں کے بچوں کے ساتھ اسکولوں میں کھلے عام تعلیم پا رہے ہیں۔ بڑے بڑے خطابات مثلاً ہیرو آف دی سوویت یونین، ہیرو آف سوشلسٹ لیبر اور اسٹالین پرائز پانے والوں میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ سوویت یونین میں مسلمانوں کو دوسرے لوگوں کی طرح اقتصادی، معاشی اور تہذیبی حق حاصل ہیں۔ خوب صورت اور ہرے بھرے آباد شہروں میں وہ رہے بسے ہوئے ہیں۔ ہزاروں اسکول، یونی ورسٹیاں، تہذیبی مرکز، ہال، عمارتیں تھیٹر، پارک، آرام گھر، صحت گھر، بچوں کی تفریح گاہیں، تربیت گاہیں قائم کر دی گئی ہیں۔ ہزاروں ڈاکٹر، انجنیئر، سائنس داں اور زرعی معاشیات کے ماہرین مسلمان ہیں۔

قاضی حافظ ضیاء الدین قزاقستان کی مسلم دینی مجلس کے نائب صدر نے اپنی تقریر میں بتایا تھا کہ "سوویت حکومت نے مسلمانوں کے لئے قابل تعظیم اور مقدس مقامات یعنی شاہ زندہ کا مزار (سمرقند) قفل شاشی (تاشقند) پاولن عطا (خیوا) اور دوسرے مقامات مقدسہ انھیں واپس کر دئے اور

مسلمانوں کی مذہبی اور تاریخی یادگاروں کو بحال کر رہی ہے اور ان کی حفاظت کر رہی ہے۔

وسطِ ایشیا اور قزاقستان کے مسلمانوں کے لئے بخارا میں ایک مذہبی کالج قائم کیا گیا ہے۔

سوویت یونین میں جن پانچ جمہوریتوں کی کثیر آبادی مسلمانوں کی ہے۔ (ازبک، کرغیز، قازق، تاجک اور ترکمان) ان کے مسلمان باشندوں کی ایک کانفرنس دسمبر ۱۹۴۸ء میں تاشقند میں ہوئی تھی۔ اس کانگرس کو مبارک باد کا پیغام بھیجتے ہوئے مسلم دینی مجلس کے صدر مفتی احسان بابا خاں ابن عبدالمہدی خاں نے کہا تھا۔ "سوویت نظام حکومت میں وسطِ ایشیا اور قازقستان کے مسلمانوں کو مکمل آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ یہ وہی ہیں جنھیں زارشاہی دور میں ظلم و تشدد کا شکار ہونا پڑتا تھا، اب وہ قرآن شریف کی دینی تعلیمات پر عمل کر سکتے ہیں۔"

علماء اور پادریوں کے علاوہ ان لوگوں کے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جو مذہبی خیالات رکھتے ہیں اور خود سوویت یونین جاکر وہاں کی مذہبی زندگی دیکھ آئے ہیں اور ان تمام مذہبی علماء سے مل آئے ہیں۔

برطانیہ کے لاٹ پادری ڈاکٹر ہولٹ جانسن ڈین آف کنٹربری نے اپنی کتاب "اشتراکی روس" میں بھی لکھا ہے اور کئی موقعوں پر بیانات دیے ہیں کہ سوویت یونین میں مذہبی عقائد رکھنے اور ان پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے اور وہاں ایسے بہت لوگ موجود ہیں جو آج بھی اپنے عقائد پر قائم ہیں۔ گرجاؤں

اور مسجدوں میں پابندی سے عبادت کرنے جاتے ہیں وغیرہ۔ وہ سوویت یونین کے سماج میں سچی پاکیزگی اور رواداری کا سچا روپ نظر آتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی جو ہندستان سے ہجرت کرکے چلے گئے تھے اور جنھوں نے لینن کی زندگی میں روس کا دورہ کیا تھا خود راقم الحروف کو بتایا کہ "یہ سامراجیوں کا پروپیگنڈا ہے کہ روس میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم کیا جاتا ہے، جو لوگ سامراجیوں کے ایجنٹ ہیں وہ خواہ کوئی مذہب رکھتے ہوں انھیں کوئی اشتراکی ریاست کیسے برداشت کرسکتی ہے۔"

حال میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے دیا تا امن کانفرنس کے بعد ماسکو اور اس کے قرب وجوار کی سیاحت کی۔ واپسی پر انھوں نے ایک بار سے زیادہ کھلے لفظوں میں بتایا کہ وہاں کوئی مذہبی تفریق نہیں ہے اور نہ کوئی مذہبی یا غیر مذہبی جبر ہے۔ انھوں نے وہاں مسجدیں بھی دیکھیں اور مذہبی لوگوں سے ملاقات بھی کی۔ اور انھیں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئی۔

جنگِ عظیم سے پہلے ایک بار برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ایک ممبر نے وزیرِ خارجہ سے سوال کیا کہ روس میں مذہبی آزادی کا کیا حال ہے؟ روس میں برطانوی سفیر سے تحقیق کی گئی اور اس کا جواب آنے پر سر اسمانڈ ہوری نے پارلیمنٹ میں بیان دیا کہ:۔

"جہاں تک لفظ ظلم کے صحیح مفہوم کا تعلق ہے، روس میں مذہبی ظلم

یا زیادتی کا وجود نہیں ہے اور ایسے کسی ایک واقعے کا بھی پتہ نہیں چلا کہ کسی پادری کو یا کسی اور شخص کو مذہبی فرائض بجالانے کے سلسلے میں سزا دی گئی ہو۔"

لیکن وہی اخبارات خاص طور سے مذہبی خیال کے پرچے جو روس اور کمیونسٹوں کے خلاف مذہبی ظلم کا پروپیگنڈا کیا کرتے تھے، اس بیان کو سُن کر خاموش ہو گئے اور انھوں نے اسے شائع نہیں کیا (مانچسٹر گارڈین کے علاوہ)

روس کے بعد دوسرا بڑا ملک چین ہے جہاں کمیونسٹوں کی رہنمائی میں عوام نے انقلاب کیا۔ چین میں انقلاب کی کامیابی اس وقت ہوئی جب سوویت روس میں تیس برس تک دنیا میں پہلی بار اشتراکی سماج تعمیر کرنے کا تجربہ کیا جا چکا تھا اور اس تجربے نے چین کے انقلاب کے لئے نئی تدبیروں کے باب کھول دئے تھے۔

چین ایک ایسا ملک تھا جہاں مذہب کی وہی حالت تھی جو آج ہندستان اور پاکستان میں اور ایران میں ہے۔ چناں چہ چینی کمیونسٹوں نے ابتدا سے ہی مذہبی آزادیوں کے سلسلے میں ہر ممکن تدبیر اختیار کی اور کسی قسم کی حرکت جس سے مذہبی اعتقاد والوں کو تکلیف پہنچتی ہو، قابلِ سزا، جرم قرار دی گئی۔ خود چین کی سپاہِ آزادی میں ایسے کسان اور شہری شامل تھے جو مختلف مذہبی

عقائد رکھتے تھے اور اپنے عقائد کے مطابق عبادت کرتے تھے۔ انھیں اس کی آزادی تھی اور اس آزادی کا احترام کیا جاتا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۹ء کے آخری ہفتے میں نانکنگ کی فتح کے بعد ملک کا آئین بنانے اور انتظامی معاملات طے کرنے کے لئے پورے چین کی ایک "سیاسی مشاورتی کانفرنس" بٹھائی گئی۔ اس کانفرنس میں ہر ایک علاقے سے نمائندے چن کر آئے تھے اور نمائندوں کی تعداد پہلے سے مقرر کر دی گئی تھی۔ یہ کانفرنس کمیونسٹ پارٹی کے صدر ماؤزے تنگ کے ایک اعلان کے مطابق منعقد ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ علاقہ وار اتنے نمائندے چنے جائیں۔ کسان سبھاؤں کے اتنے نمائندے۔ مزدوروں کے اتنے نمائندے، نوجوانوں کے اتنے۔ یونی ورسٹی کے اتنے۔ فوج کے اتنے۔ اسی طرح فہرست میں بتا دیا گیا تھا کہ الگ الگ قومی زبانوں اور علاقائی جمہوریتوں سے دس نمائندے شامل ہوں گے۔ اور مذہبی گروہوں کے سات نمائندے چناں چہ اس عظیم الشان اور تاریخی کانفرنس میں جنوبی چین کے وہ نمائندے بھی آئے تھے جو آج تک تقریباً عربی رسم الخط پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ ان علاقوں کے نمائندے بھی تھے جن کی تہذیب اور وطنی حلقے کو چین سے بہت کم واسطہ رہا ہے اور جنھیں کبھی انتظامی معاملات میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ اس کانفرنس میں چین کے بوڑھے مسلمان علما، بھی شامل تھے۔ بدھ راہب بھی اور پادری بھی۔ اسی کانفرنس نے پورے چین کے لئے وہ آئین طے کیا جس کے تحت آج

چینی حکومت کام کر رہی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ان مذہبی علماء کو کسی انتظامی معاملے میں حصّہ لینے کا موقع ملا۔

۱۹۴۹ء میں جب چینی سپاہِ آزادی چیانگ کائی شک کو شکست دے کر سنکیانگ اور دوسرے علاقوں کی طرف بڑھ رہی تھی، اس وقت فوجی ہائی کمانڈ نے ان کے نام احکام جاری کئے تھے کہ:۔

۱۔ مسجدوں اور علماء کی حفاظت کرو۔ فوجوں کو مسجدوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ مسجدوں کی دیواروں پر پوسٹر یا اس قسم کی دوسری چیزیں چسپاں مت کرو (۲) مسلمانوں کے گھروں میں گھوڑے، سُور یا خچر کا گوشت مت کھاؤ (۳) مسلمان عورتوں کی طرف نگاہ مت اٹھاؤ اور نہ ان کے گھر میں داخل ہو (۴) مذہبی عبادت کے وقت شور مت مچاؤ۔ کسی قسم کی مداخلت مت کرو (۵) مسلمانوں کے کنویں سے پانی نکالنے سے پہلے ہاتھ پاک کر لو۔ ان کنوؤں میں ناپاک اور نجس پانی مت ڈالو —— (۶) مسلمانوں کو "برادرانِ وطن اور بھائی" کہہ کر پکارو۔ کبھی حقارت کے الفاظ استعمال مت کرو (۷) مسلمانوں کے گھروں میں شراب نوشی اور سگرٹ نوشی مت کرو (۸) مسلمانوں کی موجودگی میں سُوّر کا نام مت لو۔ اُن سے یہ نہ پوچھو کہ فلاں فلاں گوشت کیوں نہیں کھاتے یا یہ کہ مسجدوں سے کیا فائدہ؟ (۹) ہر مسلمان کو تفصیل کے ساتھ بتاؤ کہ اقلیتوں کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کا برتاؤ کیسا ہے اور پالیسی کیا ہے۔

چین بھی کئی مذہبوں کا گہوارہ ہے ان میں سب سے قدیم اور سب سے

زیادہ آبادی بدھ مذہب کے ماننے والوں کی ہے، اس کے بعد مسلمانوں کا نمبر ہے جن کی تعداد ایک کروڑ سے کچھ زیادہ ہے۔ پھر عیسائی اور اس کے دوسرے اقلیتی مذاہب۔ تنہا ہوئی قوم کے مسلمانوں کی تعداد ساٹھ لاکھ کے لگ بھگ ہے اور باقی میں اُزبک، کرغیز، تاتاری، تاجک، سلاس، قازق وغیرہ۔ انقلاب کی فتح ۱۹۴۹ء سے پہلے چیانگ کائی شک کی حکومت انھیں وحشی اور نیم وحشی قبیلے شمار کرتی تھی۔ ان کی زبان، مذہب اور تہذیب کو کوئی علاحدہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے الزامات پر ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کے علاقوں میں چینی فوج بھیج دی جاتی تھی۔ جو اُن کے دیہاتوں کو تاخت و تاراج کر دیتی تھی۔ ان کی مسجدوں میں سُور کا گوشت ڈلوا کر انھیں مشتعل کیا جاتا تھا اور اس کے بعد جب فرقہ وارانہ فساد ہوتا تو اس کی آڑ لے کر چین کی اکثریت والی نسل ہان سے ان پر حملہ کرا دیا جاتا۔ ۱۹۲۸ء میں اس طرح کا ایک قتلِ عام ہوا جس میں دس ہزار کے قریب ہوئی قتل کر دئے گئے۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۱ء کے دوران بھی ایسے دو قتلِ عام ہوئے۔ لیکن آج ـــــــــ ان واقعات کا تصور نہیں ہو سکتا۔

۱۹۴۹ء کی فتح کے بعد سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ ہوئی قوم کے مسلمانوں کا ایک خود مختار ضلع (ہماری اصطلاح میں صوبہ) کوئی سوئی میں قائم کر دیا گیا۔ اور شمال مغرب کے مختلف علاقوں میں بسے ہوئے مسلمانوں سے ایک اعلان کے ذریعے کہہ دیا گیا کہ تمھاری زبانیں آزاد ہیں۔ تمھارا مذہب آزاد ہے اور تم ہان قوم کی زبان سیکھنے پر یا اپنے مذہبی عقائد کو چھپانے اور ظاہر

کرنے پر مجبور نہیں ہو۔ اور ان پس ماندہ لوگوں کے بچوں میں مفت تعلیم لازمی کر دی گئی۔ ان کے علاقوں میں خاص خاص عہدے انھی کو دئے گئے اور پھر سے وہ مسجدیں آباد ہوئیں جو پہلے میچو خاندان اور بعد میں کومن تانگ راج کے دور میں اجڑ چکی تھیں۔ تنہا ایک شہر پکینگ میں ایسی ۴۵ مسجدیں ہیں جن میں عیدالفطر کے روز جون ۱۹۵۲ء میں ستر (۷۰) ہزار مسلمانوں نے غیر ملکی نمائندوں اور مہمانوں کے ساتھ نماز عید ادا کی۔

ابھی کچھ روز ہوئے جب پکینگ کی امن کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے ہندستان اور پاکستان کے وفد بھی گئے تھے اور ان میں پنڈت سندرلال۔ ڈاکٹر کے سی کمار اپا اور پیر مانکی شریف جیسے مذہبی حضرات موجود تھے لیکن انھوں نے اپنے اپنے ملکوں میں واپسی پر جو بیانات دئے وہ خود اس بات کے شاہد ہیں کہ نئے چین میں ہر مذہب کو مکمل آزادی ہے اور کوئی اونچ نیچ نہیں برتی جاتی۔ بلکہ اس تین سال کے عرصے میں وہ زبانیں پھر سے زندہ ہو گئی ہیں جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اور جنھیں بدیشی کہہ کر چیانگ کائی شک کے زمانے میں اتنا پسپا کر دیا گیا تھا کہ وہ منظر عام سے غائب ہو گئی تھیں۔

چین میں مسیحی مذہب کے ایک فرقے پروٹسٹنٹ کے لیڈر دو یا ڈکنگ نے ایک مفصل مضمون لکھا تھا "چین میں مذہب آزاد ہے" اور اس خط میں انھوں نے مختلف پادریوں اور علمار کی تحریروں اور بیانات کے حوالے دئے تھے جس میں ایک بیان مشرقی چین کے صوبہ کیانگ سُو کے ایک پادری (Pastor) کا

تھا جو لکھتا ہے کہ:۔

"آزادی کے فوراً بعد ہمارے چرچ کو اندیشہ تھا۔ مجھے خود بھی ڈر تھا کیونکہ امریکیوں اور کومن تانگ والوں نے ہمیں یہ سکھا رکھا تھا کہ کمیونسٹ آئیں گے تو وہ مذہب کو تباہ کر ڈالیں گے اور کلیسا (چرچ) پر زیادتیاں کریں گے لیکن یہ سب افواہیں ہوا میں اڑ گئیں۔ ہمارے گرجا گھر میں کبھی کوئی نماز، کوئی اجتماع ناغہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برخلاف اب اس کی حالت اچھی ہے۔ وہ فروغ پا رہا ہے اور اس کے ممبر بڑھ رہے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ پچھلے چار سال میں کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کو کمیونزم اور انقلاب کے دشمنوں نے توڑ مروڑ کر خوب اچھالا۔ مثلاً ٹنٹ سین کے مشنریوں اور پادریوں کا واقعہ۔ یہ لوگ کسی عبادت گاہ سے نہیں بلکہ ایک فرانسیسی یونی ورسٹی سے متعلق تھے۔ ٹنٹ سین کی اس یونی ورسٹی کی داستان بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ پہلے اس یونی ورسٹی کے لئے اس کے قائم کرنے والے پادریوں نے فرانسیسی حکومت سے اس وعدے پر مدد لی کہ وہ چین کے بارے میں خفیہ معلومات بہم پہنچائیں گے اور یہ کام کئی برس کرتے رہے۔ فرانس کے زوال اور ہٹلر کے تسلط کے بعد انھوں نے جاپانیوں اور تاتاریوں سے ساز باز کر لی۔ ان کی شکست کے بعد کومن تانگ اور امریکیوں کا استقبال کیا۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن کا راز ۱۹۵۱ء میں کھلا او خود ہنری کس پولٹ اور لڈ وکیس ڈانس نے تحریری بیانوں میں اپنے ان جرائم کا اعتراف کیا۔ اور ان کے مکانوں سے خفیہ کاغذات اور آلات

بھی بر آمد ہوئے۔ اور طالب علموں اور استادوں کی گواہیوں سے بھی ثبوت ملا۔ لیکن ان کے جرائم کے باوجود یونی ورسٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ اس کے برعکس ہوا یہ کہ حکومت نے یونی ورسٹی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا مسیحیت کی تعلیم کا شعبہ الگ کر دیا گیا اور دوسرے صنعتی اور علمی شعبوں کو ترقی دی گئی۔ پہلے یونی ورسٹی کے جتنے مصارف تھے اب اس سے زیادہ ہیں لیکن پہلے ان مصارف کا ۹۰ فیصدی طالب علموں کی فیس سے حاصل ہوتا تھا مگر اب کوئی فیس نہیں ہے اور تعلیم مفت ہے۔

اس قسم کے واقعات سے حقیقت یہ کھلتی ہے کہ مذہب کے پردے میں کس طرح مخالفانہ کارروائیاں کی جاتی رہی ہیں اور مذہب کے مبلّغین کیوں کر چھپے چوری شہنشاہیت کی تبلیغ اور عوام کے دشمنوں کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

چین میں جس آئین کے مطابق آج عمل ہو رہا ہے اس میں صاف طور پر مانا گیا ہے کہ ہر عقیدے کے اور ہر ایک مذہب کے لوگوں کو اپنے ضمیر کے مطابق اور عقائد کے مطابق رسوم بجا لانے کی پوری آزادی ہوگی۔

چین کے علاوہ مشرقی یورپ کی دوسری جمہوریتیں ہیں جنھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ کمیونسٹوں کے اقتدار میں لوگوں کے مذہبی جذبات کا کس درجہ احترام کیا جاتا ہے اور کس قدر مذہبی آزادیاں دی جاتی ہیں۔

ھنگری مشرقی یورپ کی ایک طاقتور صنعتی جمہوریہ ہے۔ وہاں عوامی جمہوریہ قائم ہونے کے بعد ایک اعلان کے ذریعے لوگوں کو ضمیر، اعتقاد اور

مذہب کی پوری آزادی دی گئی۔ جو گرجا جنگ کے زمانے میں برباد ہو گئے تھے، انھیں پھر سے درست کیا گیا۔ آس پاس کی زمین انھیں دی گئی۔ چرچ کے علاقے کو اجازت دی گئی کہ وہ پندرہ ایکڑ زمین تک اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں مذہبی فرقوں کو اپنا خرچ چلانے اور جنگ کے نقصانات کی تلافی کرنے کے لئے ہنگری کے سکے ۷ کروڑ اسّی لاکھ فورینٹ کی امداد دی گئی۔ جنگ کی بمباری وغیرہ سے ۵۰۰ گرجاؤں کو نقصان پہنچا تھا۔ انھیں پھر سے بنوا دیا گیا اور مذہبی اخبارات و رسائل چھاپنے کے لئے اخباری کاغذ کی بڑی مقدار دی گئی۔ پروٹسٹنٹ چرچ نے اس امداد کا خیر مقدم کیا۔ لیکن کیتھولک چرچ کے بڑے پادری نے امریکی چرچ کے ذریعے امریکہ کے جاسوسی حلقوں سے ساز باز کر لیا جس کا راز دیر سے کھلا اور فروری ۱۹۴۹ء میں کارڈنل منڈزنتھی پر مقدمہ چلایا گیا۔

یہ ہے وہ عملی مثال جس کی نظیر پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اور یہ وہ عمل ہے جس نے ثابت کر دیا ہے کہ کمیونسٹوں کا قول اور عمل دراصل ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ کمیونسٹ تحریک جہاں عوام کو معاشی مصائب اور طبقاتی جبر کے پنجے سے آزاد کرنے بڑھی ہے وہاں ذہنی اور روحانی مصائب اور مذہبی جبر سے بھی آزاد کر رہی ہے۔ کمیونسٹ نظام کے سائے میں ہر ایک مذہبی عقیدے کی حیثیت ایک ہے۔ نہ کوئی "دین ملوک" رہا ہے، نہ "دین محکوم"۔

کمیونسٹ وہ سماج قائم کر رہے ہیں جس کا خواب بڑے بڑے نبیوں

پیغمبروں، رشیوں، منیوں اور خدا ترس بزرگوں نے دیکھا تھا۔ لیکن جس کی تعبیر طبقاتی سماج میں ممکن نہیں تھی۔ ہر ایک مذہب کے سچے عقیدت مندوں کو عمر بھر شکایت رہی کہ ان کا دین پوری طرح پھل پھول نہ سکا اور آگے چل کر ہوس پرستی اور اکسپلائی ٹیشن کا شکار ہو گیا۔

ہوس سینوں میں چھپ چھپ کر بنالیتی ہے تصویریں

مذہب کے وجود میں آنے کے بعد سے انسانی تاریخ میں یہ پہلا موقع آیا ہے جب سماج کو طبقاتی کش مکش سے نجات مل رہی ہے اور مذہب کو ہوس پرستوں کے پنجے سے آزاد کیا جا رہا ہے۔

آنکھوں دیکھی

مذہب اور کمیونزم کے سلسلے میں لکھے ہوئے ان مضامین کو آج پورے پانچ سال ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر کتابوں کے مطالعے، اخباروں کی اطلاعات اور سُنی سنائی بہت سی معلومات کے اور نظریاتی طور پر قائل ہو جانے کے باوجود ایک دُگدا رہا کہ اشتراکی سماج کے قول و فعل میں کہیں اختلاف تو نہیں ہے؟ جو کچھ ہم فریقین سے سنتے ہیں ان میں بہت سی باتیں دل کو لگتی ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ خود اشتراکی سماج میں مذہب کے لئے کیا امکانات ہیں۔ اور جن اخلاقیات کا وہ اعلان کرتا ہے کہاں تک اہلِ مذہب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ چناں چہ سوویت یونین میں اٹھارہ مہینے عام لوگوں کے درمیان آزادانہ زندگی بسر کرنے اور خود انہی کی زبان اور طرزِ معاشرت اختیار کئے رہنے کے بعد حقیقتوں کی چھان بین کرنے سے میں جن نتیجوں پر پہنچا ہوں وہ بہت امید افزا ہیں۔ نہایت مختصر طور پر ان کا تذکرہ اس کتاب کو کسی حد تک کارآمد بنا سکتا ہے۔

سوویت یونین کی رہنما کمیونسٹ پارٹی کا دعویٰ ہے کہ سماج سے ایک دوسرے کے مخالف طبقوں کا وجود ختم کرنے کی راہ میں ملک اشتراکیت کی منزل کو پہنچ چکا ہے اور کمیونزم کی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھا رہا ہے گویا سوویت یونین کی سرزمین پر زندگی کے تانے بانے سخت اندرونی کشمکش سے آگے بڑھ گئے ہیں اور عبوری دَور کے ہنگامی تقاضوں سے انھیں نجات مل چکی ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب وہاں مذہبی حالت کے بارے میں ایک صحیح اور متوازن فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

چناں چہ، مسجد و کلیسا میں جا کر اور اہلِ مذہب میں گھُل مل کر مجھے اندازہ ہوا کہ ایک مقررہ دور تھا جو گزر گیا اور اب کمیونزم کے نظریے اور عمل کو کسی مرحلے پر بھی مذہب سے جنگ کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ بلکہ مذہب نے اپنا بنیادی مقصد بدلے بغیر لا مذہب اسٹیٹ اور غیر مذہبی اقتدار سے خوش گوار مصالحت کر لی ہے:

من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاہے

اور اس مصالحت میں نہ نیت توڑنی پڑی نہ رکعات چھوڑنی پڑیں بلکہ صرف قبلہ بدل گیا ہے۔ قبلۂ اوّل تھا اہلِ زر اور صاحبِ حیثیت طبقہ۔ قبلۂ دوم ہے اہلِ محنت اور عوام۔ مذہبی ادارے اب کسی خاص طبقے کا فکری ہتھیار نہیں ہیں بلکہ عاقبت سدھارنے کا سینی ٹوریم بن گئے ہیں اور مذہبی اعتقاد رکھنے والے صرف وہی لوگ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جو صدقِ دل سے اس کے آرزومند ہیں کہ موجودہ زندگی کے بعد کی زندگی

میں سُرخ روئی حاصل کر لیں۔

ماسکو شہر کے پرانے روسی آرتھوڈکس چرچ میں عین عبادت کے وقت ایک بوڑھے پادری نے نمازیوں کی طرف اُنگلی اٹھا کر مجھ سے کہا ۔ "آپ دیکھتے ہیں یہ چہرے ؟ ان پر صدق دل اور عقیدت کا نُور ہے، ان پر نہ دکھاوے کا گمان ہو سکتا ہے نہ رسمی اعتقاد کا نہ وقت گزاری کا۔" واقعی کوئی آٹھ سو سے زیادہ نمازی مراقبے کی سی کیفیت میں ڈوبے ہوئے کورس گا رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ محراب میں موم بتیاں جل رہی تھیں اور زرق برق گرجا گھر کا ہال یہاں سے وہاں تک ایسا بھرا ہوا تھا کہ ایک نشست بھی خالی نہ تھی۔ جو مرد و زن سامنے دکھائی دے رہے تھے ان میں ادھیڑ عمر کی بڑی اکثریت تھی۔ اور نوجوان لڑکیاں بھی خال خال نظر آرہی تھیں۔ پچیس برس سے کم کے تعلیم یافتہ نوجوان لاپتہ تھے۔

مجھے واقعی تعجب ہوا کہ اگر نئی نسل میں سائنس اور تکنیک کی ترقی کی بدولت مابعد الطبیعیات اور آسمانی شریعت پر سے اعتقاد کم ہوا ہے تو یہ پورا ہال کیسے بھر گیا۔ پھر میں نے سوال کیا تو اس سفید ریش بزرگ نے جواب دیا۔ "ہاں یہ درست ہے کہ پورا ہال بھرا ہوا ہے اور انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء سے پہلے ہجوم اب سے کئی گُنا زیادہ ہوا کرتا تھا۔ گرجا گھر کے سارے احاطے میں دن بھر بھیڑ رہا کرتی تھی۔ لیکن اس زمانے کے ہجوم میں، اور آج کل کے عبادت گزاروں میں مقصد اور جذبے کا نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ تب کچھ لوگ آتے تھے دنیاوی وجاہت دکھانے، نوجوان لڑکوں اور

لڑکیوں میں بہت سے عبادت کے بہانے ایک دوسرے سے ملنے کے لئے آجایا کرتے تھے اور اکثریت محض عادت اور رسمِ دُنیا کی خاطر آیا کرتی تھی مگر اب ہماری عبادت گاہ صرف عبادت گاہ ہے۔ دنیاوی مقاصد کے حصُول کا وسیلہ نہیں ہے۔ جب تک ایمان سلامت اور عقیدہ پختہ نہ ہو کوئی گرجا گھر میں تماشا اور تماشائی بن کر نہیں آتا ہے؛

میرے لئے اس جواب میں اور عبادت گزاروں کی "عقیدت کے نور" سے دمکتی ہوئی پیشانیوں میں قائل کر دینے والی دلیل موجود تھی۔

انیسویں صدی کے وسط کا ایک مسیحی فرقہ ہے جو روسی زبان میں، "سبوتنیکی" کہلاتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کی اکثریت امریکہ میں اور مغربی یورپ اور بلقان کے کئی ملکوں میں مرکوز ہے۔ یہ ہیں ساتویں دن کے Adventist۔ اُن کی اور Baptist فرقے کی عبادت گاہ ماسکو میں یک جا ہے۔ یہ فرقہ مسیحی مذہب میں قریب قریب ویسے ہی عقائد رکھتا ہے جیسے مسلمانوں میں وہابی۔ قرن اوّل کی اصل انجیل اور اس کے احکام کے علاوہ ان کے نزدیک کوئی شے مستند نہیں ہے۔ وہابیوں کی سی ہی سادہ پسندی، رسوم سے بے زاری اور اُنہی کا سا استدلال اور کٹرپن ان میں پایا جاتا ہے۔ مجھے ان کی عبادت میں شریک ہونے کا اتفاق کئی بار ہوا۔ تعداد اُن کے ہاں سب سے کم ہوتی ہے مگر اس میں نوجوان بھی نظر پڑتے ہیں۔ ان میں سائنس، ادب اور ڈاکٹری کے طالب علم بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے پنشن یافتہ جنرل بھی۔ اور اپنے عقیدے اور عمل میں ایسے صادق؛

کٹڑ اور بے لوچ کہ میں نے ایشیائی ملکوں کے اہلِ مذہب میں بھی ان کی مثال نہیں دیکھی۔ پہلی بار جب میں عبادت شروع ہونے کے بعد پہنچا تو ایک کورس گایا جا رہا تھا۔ جس کے پہلے دو مصرعوں کا مفہوم یہ ہے :۔

"وہ وقت قریب ہے جب ہمارا رہبر زمین پر ظاہر ہوگا۔ اور مومنوں کی اقلیت اس کے ہم رکاب ہوگی"

اور پھر بعد کے الفاظ سے مجھ پر کھلا کہ یہاں بھی وہی عقیدہ موجود ہے جو سورۂ اذا زلزلت الارضُ زلزالھا میں پایا جاتا ہے۔ عبادت کے ختم ہونے پر میں نے کئی اڈونٹسٹوں کو روکا اور ان سے پوچھا کہ کیوں صاحب! یہ آپ کا رہبر کمیونسٹ سماج کے قیام کے بعد ظاہر ہوگا یا اس سے پہلے۔ وہ اسے توڑنے کے لئے زمین پر آئے گا یا اسے جمانے کے لئے؟ جواب ملا۔ ایک ایسے سماج کو جمانے کے لئے جس میں آدمی آدمی پر ظلم نہ کر سکے۔ کمیونسٹ پارٹی کی منزل مقصود بے طبقہ سماج یقیناً سرمایہ داری کے مقابلے میں ترقی یافتہ اور منصفانہ سماج ہوگا اور ہمارا رہبر اسے خدائے واحد کا عقیدہ اور نیک عمل کی توفیق عطا کرے گا۔

اب میرے سامنے یہ بات صاف تھی کہ کلیسا نے کمیونسٹ پارٹی کے اقتدار سے کیوں کر مصالحت کی ہے۔

اس فرقے کی عبادت گاہ میں اکثر غیر ملکوں کے مبلغ آتے رہتے ہیں اور اپنے اپنے ہاں دینی تبلیغ کی فتوحات بیان کرتے ہیں، جہاں تک آیات کی تفسیر اور عقائد کی تاویل کا تعلق ہے ان پر کوئی پابندی نہیں۔

خود ان سطروں کا لکھنے والا کئی بار ان لوگوں کی کھلے بندوں تبلیغ کا نشانہ بن چکا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ چالیس سال کی چھان پھٹک کے باوجود اب تک ایسے مذہبی مبلغ آتے جاتے رہتے ہیں جو انجیل کے درس کے سلسلے میں اپنے مریدوں کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ "صدائے امریکہ" کی براڈکاسٹ ان کے لئے مفید رہے گی اور یہ کہ سوویت یونین کی کامیابیاں دراصل قربِ قیامت کی دلیل ہیں اور عنقریب مغربی ایشیا میں خون کا طوفان اُ... اور تمام دنیا اس طوفان میں ڈوبے گی۔ صرف چند اہلِ ایمان سلامت رہ جائیں گے اور جتنے اڈونٹسٹ مجھ سے ملے اُن میں یہ عقائد اور اندیشے یکساں طور پر عام تھے۔

سوویت ایشیا میں تو بے شمار مسجدیں ہیں جن میں نمازیں اور درسِ قرآنی جاری ہے۔ لیکن ماسکو میں ایک جامع مسجد ہے جہاں جانے کی فرصت مجھے کئی بار میسر ہوئی۔ یہ مسجد بہت قدیم ہے اور اس کے پیازی گنبدوں کا طرزِ تعمیر ماسکو کے مشہور قلعے کریملن کے سامنے کے گرجا گھر سے مشابہ ہے۔ معلوم نہیں کہ اولیت کا شرف کس کو حاصل ہو مگر طرزِ تعمیر مسجد اور گرجا کا قریب قریب ایک سا ہے اور دونوں میں تورانی (تاتاری) گنبد پایا جاتا ہے جو ایرانی اور راجپوتی طرزِ تعمیر سے میل کھا کر شمالی ہند کی مسجدوں اور مقبروں پر نمودار ہوا۔

نمازِ جمعہ میں آج بھی یہاں بڑا ہجوم ہوتا ہے اور تمام احاطہ بھر جاتا ہے۔ خطبہ بھی ہوتا ہے جس میں سلطان یا خلافت کے بجائے محنت کش

طبقے کی کامیابیوں اور امنِ عالم کی "درازیٔ عمر" کے لئے دُعا کی جاتی ہے مسجد کے باہر بھی راہ گیروں کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں۔ جو نفرت یا تحقیر کی جگہ معصومانہ حیرت سے نمازیوں کی صفوں کو اور ان کے قیام و قعود کو دیکھتے ہیں اس مجمع میں بھی تعلیم یافتہ نوجوان خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں اور ادھیڑ عمر کے خستہ حالوں کی ٹولیاں اگر کہیں یکجا نظر آئی ہیں تو بس تین مقامات پر۔ صحن مسجد میں۔ پُرانے تاڑی خانوں میں یا گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں۔ اور پورے ملک میں پہلی بار فی سبیل اللہ خیرات مانگنے والے بھی انہی مقامات کا چکر کاٹتے ہوئے مل جاتے ہیں۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا لیکن اس کی توجیہہ اور تجزیہ اپنی طرف سے پیش نہیں کرنا چاہتا۔

مذہبی کتابوں کی اشاعت کی عام اجازت ہے اور مذہبی اداروں کے پاس دین داروں کے چندے سے اتنے فنڈ بھی موجود ہیں کہ وہ توریت، زبور و انجیل اور قرآن شائع کر سکیں۔ لیکن عام طور سے وہ شائع ہوتے نہیں غالباً اس لئے کہ یہ اب کوئی منافع بخش تجارت نہیں رہ گئی ہے البتہ غیر ممالک سے ذاتی طور پر یا تحفوں میں درآمد کئے جاتے ہیں۔ کئی تاتاری مسلمان خاندانوں کو ہمارے ذریعے قرآن کی جلدیں مہیّا ہوئیں۔

ایسے لوگ بھی کہیں کہیں ملتے ہیں جو کام کے وقت سے فراغت پا کر گھر گھر جاتے ہیں اور اپنے اپنے مذہبی عقائد کا پرچار کرتے ہیں۔ ان کی یہ تبلیغی مہم کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی تو مناظرے کی صورت پیدا

کردیتی ہے۔ شہری قانون اس میں کوئی رخنہ نہیں ڈالتا۔

ممکن ہے انقلاب کی فتح کے شروع برسوں میں ـــ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۵ء تک جیسا کہ بوڑھے بوڑھے لوگوں سے بات چیت کرنے پر پتہ چلتا ہے، اہل مذہب کو ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو جو خود اہل مذہب کے ہاتھوں منکروں نے ساری دنیا میں ہزاروں سال برداشت کی ہیں۔ لیکن اب نہ دار و جبر کا نام و نشان حافظے کے سوا کہیں باقی نہیں ہے بلکہ جن خانقاہوں، گرجاؤں، عبادت گاہوں کی حالت سقیم ہو گئی تھی، انھیں پھر سے تعمیر کیا جا رہا ہے ان کے محراب و منبر پر قلعی کی جاتی ہے ان میں اصل رنگ و روپ دیا جا رہا ہے ان کے صحن میں تختۂ گل اور چمن لگائے جا رہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ کام آثارِ قدیمہ کے محکمے کی طرف سے انجام پا رہے ہیں اور ان میں مذاہب کا کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔

بڑے شہروں سے باہر اور دیہات میں شاید ہی کوئی بستی ایسی ہو جہاں گرجا گھر، قبرستان یا خانقاہ بدستور باقی نہ ہو۔ وہاں آج بھی صبح و شام گھنٹے بجتے ہیں اور عبادت گزار جوق در جوق کھنچے چلے آتے ہیں بعض دیہات میں گرجا گھروں کی رونق دیکھ کر جہاں مجھے ایک طرف مذہب کی سخت جانی کا قائل ہونا پڑا وہاں یہ بھی احساس ہوا ہے کہ ایمان بالغیب اور مذہبی رسوم کا براہ راست ٹکراؤ اشتراکی سماج سے اتنا نہیں جتنا طبعی سائنس اور تکنیک کی ترقی سے ہے۔ دور افتادہ دیہات میں آج بھی یہ گمان نہیں گزرتا کہ ہم اس سرزمین پر ہیں جہاں غیب پر

ایمان، غیر مادّی طاقتوں پر اعتقاد اور اندھی تقدیر پر راضی ہونے کے خلاف استدلال رکھنے اور پرچار کرنے والیوں کو چالیس برس سے ریڈیو اخبار اور پروپیگنڈے کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سوویت یونین میں آج منکروں کا پلّہ بھاری ہے اور اہلِ مذہب ان کے آگے اگر بے بس نہیں تو کمزور ضرور ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت ان میں ریاست، دستور اور اس نظام زندگی کے خلاف بغاوت کی چنگاری پیدا کرتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ ایسے سخت مذہبی لوگ بھی، جو اپنے دینی عقائد سے پچاس برس میں ایک انچ نہیں سرکے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ انھیں کمیونسٹ نظام فکر کا خدا و رسول سے بے نیاز ہونا پسند نہیں۔ اپنے یہاں کے سماجی نظام کو آسمانی برکت خیال کرتے ہیں۔ اور اس کے توڑ دینے یا ٹوٹ جانے کی تمنّا تک نہیں رکھتے کیونکہ ان کے سامنے وہ نظام زندگی بھی ہے جو مذہبی اداروں اور سرکاری اقتدار کے جائز یا ناجائز تعلقات کا نتیجہ تھا اور جس سے جہل، افلاس، پس ماندگی، غلامی، بے بسی اور باہمی تعصّب کی فضا صدیوں قائم رہی ہے۔ ہزاروں سادہ دل اہلِ مذہب سے مل کر، ہفتوں اُن سے خلا ملا رکھ کر میں نے ان میں اگر کوئی بے چینی تلاش کی ہے تو صرف اس بات کی کہ وہ وقت کب آئے گا جب اشتراکی سماج اپنی ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا وہاں پہنچے جہاں کی خبر آسمانی کتابوں نے صدیوں پہلے سے دی ہے۔

البتہ ایک واضح حقیقت ہے جس سے انکار کرنا میرے خیال میں کمیونسٹ عقلیت پسندی سے انکار کرنا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی نے سماج کی ترتیب اور تنظیم کا جو خاکہ بنایا تھا اور جس پر ایک نسل پوری طرح پروان چڑھ چکی ہے اور دوسری نسل عنفوانِ شباب میں ہے اس خاکے میں رسمی مذہب کے لئے کوئی خانہ نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ اقبال کی طرح اب یہ تمنا کرنا بے سود ہے کہ آج نہیں تو آئندہ محنت کش طبقہ مارکسی فکر میں ایمان بالغیب کی قلم لگا کر اس کی آبیاری کرے گا۔ عام طور سے اگر سوویت یونین میں کسی تعلیم یافتہ روشن فکر شہری سے یہ بات کہیے تو وہ ہنسی ضبط نہیں کر سکتا اور فوراً ہی اپنی حیرت کا اظہار کرے گا کہ کیا واقعی ٹھیک ٹھیک ناپ تول سے صحیح نتیجے اخذ کرنے کی اس دنیا میں لوگ مذہب کے مستقبل سے پُر امید ہیں؟

میں نے یونی ورسٹی کی ایک طالب علم، دفتر کی ایک کلرک اور ایک فوجی کی موجودگی میں کسی موقعے پر یہ ذکر کیا کہ استراخان میں فلاں لڑکی نے فلم کی ملازمت اس لئے ترک کر دی کہ ایک فلم میں مذہب اور خدا پر طنز پایا جاتا تھا اور وہ اسے گناہ تصور کرتی تھی۔ اب وہ ایسی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہے جہاں فرصت کا کافی وقت نکال کر عبادت الٰہی میں صرف کر سکے۔ ابھی میرا بیان پورا نہ ہونے پایا تھا کہ سب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ذاتی مذہبی عقیدے کی خاطر بھی کوئی تنگی ترشی کی زندگی بسر کر سکتا ہے؟ اگر

جب میں نے حجت کرنی چاہی اور کہا کہ اصل قوت آدمی کا عقیدہ ہے اشتراکی سماج اور کمیونزم پر پختہ عقیدے کی طاقت تھی جس نے تم سب کو ۱۹۴۲ء میں ایک صف میں کھڑا کر کے دنیا کے سب سے خوف ناک جنگی مورچے جیت لئے۔ جس نے اٹھارہ مہینے ایک شہر اسٹالن گراڈ کے محاصرے کی جفاکشی کو جنگ عظیم کی فتح کا موڑ بنا دیا۔ میں بار بار پختہ عقیدے کی اس قوت پر دلیل دیتا رہا جو جمہوریت کے خلاف اٹل استدلال کی حمایت میں ارسطو کو جام زہر پلوا دیتی ہے۔ مسیح کو صلیب پر لٹکنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے اور بے سروسامانی کے عالم میں نوزائیدہ سوئیت اسٹیٹ کو مسلح دشمنوں کے نرغے میں پروان چڑھاتی ہے۔ میری طرف سے یہ دلیل جس قدر مثالیں تلاش کر رہی تھی اسی قدر میرے مخاطبوں کی حیرانی بڑھ رہی تھی کہ بھلا مذہبی جنون کو سائنسی فکر و اعتقاد کے ساتھ برابر کے پلڑے میں کیوں کر تولا جا سکتا ہے۔

انقلاب اکتوبر کے بعد کی نسلوں میں قدامت پسند مذہب کی اس سرزمین پر آبائی مذاہب سے یہ ناآشنائی تحقیر یا نفرت یا انتقامی جذبے کی بدولت نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ نہ انھیں اس کی فکر ہے، نہ فرصت، اور نہ ضرورت۔ اور یہ کوئی عجوبہ نہیں بلکہ ان ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں بھی جہاں سے خدا اور مذہب کے ڈنکے پیٹے جاتے ہیں اور سوویت یونین کی جدید سوسائٹی کو لامذہبیت کا طعنہ دیا جاتا ہے، عام طور سے صنعتی سرگرمی اور سائنسی ہل چل میں موجودہ نسلیں مذہب اور مذہبیات سے

اسی درجہ ناآشنا ہیں، کیوں کہ نہ انھیں اس کی فکر ہے، نہ فرصت اور نہ ضرورت۔

ایشیا سے باہر کی دنیا میں ایک ہمہ گیر اور بڑی حد تک عالم گیر رجحان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختصر طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ صنعتی سرگرمی اور جدید سائنسی ترقیوں کے ساتھ بڑھتے ہوئے دوسرے ملکوں کی طرح سوویت یونین میں بھی مذہب کا کوئی سماجی رول اور اجتماعی مستقبل نہیں رہا ہے البتہ ذاتی عقیدے کی حیثیت سے اور قلبی سکون حاصل کرنے کے بہت سے نجی طریقوں میں سے ایک طریقے کی حیثیت سے مذہب، مع اپنی تمام رسوم اور عقائد کے زندہ رہے گا۔ نمازیں پڑھی جاتی رہیں گی۔ آیات کی تلاوت ہوتی رہے گی۔ اذانیں سُنائی دیتی رہیں گی۔ کلیساؤں اور مندروں کے گھنٹے بجتے رہیں گے۔ عبادت کے کورس گائے جاتے رہیں گے اور پنشن یافتہ، عمر رسیدہ، جدت سے بے زار روحیں ان سے نور و راحت پاتی رہیں گی۔ نہ کمیونزم اسے مٹانے پر کمر بستہ ہے نہ کمیونسٹ پارٹی کی اندرونی تنظیم میں آج اس کی کھپت ہے۔ دونوں طرف سے ایک طرح کی ناطرف داری اور بے تعلقی کا رویہ بن گیا ہے اور یہ رویہ ایک زمانے تک بدستور چلتا رہے گا۔

(۲)

جماعتِ اسلامی کے ایک بزرگ کی کتاب کئی برس پہلے میری نظر سے گزری تھی جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ کمیونزم کے حامیوں کو چوں کہ مادّی زندگی سے اوپر کسی قانون ساز ہستی پر ایمان نہیں ہوتا اس لئے وہ ہر قسم کی اخلاقی قدروں سے آزاد ہوتے ہیں اور ان کے ہاں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز نہیں رہ جاتی۔

اس کتاب کے کئی پیراگراف میں نے اپنی ڈائری میں نقل کر لئے تھے جن میں بتایا گیا ہے کہ روس میں انقلاب کے بعد سے اجتماعی شادیاں ہونے لگی ہیں۔ مردوں کا پورا ایک گروپ، عورتوں کے ایک گروپ سے شادی کر لیتا ہے۔ نہ کوئی کسی کی بیوی ہوتی ہے نہ شوہر۔ اور بچہ ریاست کی ملکیت۔ اور اس کرۂ ارض پہ ایک ایسی بدنصیب سرزمین بھی موجود ہے جو اس نعمت سے روز بروز محروم ہوتی جا رہی ہے جہاں خاندانی زندگی کا شیرازہ بکھر ا جا رہا ہے اور محبت مادری کی ٹھنڈی چھاؤں مادّہ پرستی کی آگ میں تپ کر تنور بن رہی ہے . . . "

"خاندانی زندگی کو انسانی معاشرے سے نکال باہر کرنے کی اصل غایت یہ ہے کہ اخلاق و انسانیت کے تمام معاشرتی تقاضے سوکھ اور سڑ جائیں . . . . "

اور اسی طرح کے ریمارک سے کر نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ اشتراکی

سماج میں ماں کی مامتا، بہن کا پیار، بھائی کی غم گساری، باپ کی شفقت عورتوں کی حیا، مردوں کی غیرت وحمیت۔ غرض وہ سب کچھ انسانی حسیات ختم ہوگئے ہیں! اور ہوتے جارہے ہیں۔ جن سے انسانی اخلاق عبارت ہے۔

ایک طرف بے حیائی اور کمینہ پن کی یہ عبارت میری نظر کے سامنے ہے اور دوسری طرف سوویت یونین کی بھرپور خاندانی زندگی کو اس کے درمیان رہ کر دیکھ چکا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ بزعمِ خود "اسلامی اخلاق" کے علم برداروں کو اس انتہا درجے کی گری ہوئی تہمت تراشی اور رکیک فریب کاری کی ہمت کیوں کر ہوتی ہے۔ اگر انسان اس قسم کے بے حس ماحول میں مطمئن رہنے کا عادی ہوچلا ہے جس کی تصویر کشی جماعت اسلامی کے ان بزرگ نے کم وبیش ڈیڑھ سو صفحات میں کی ہے تو یہ خود انسان کی توہین ہے اور عالمِ انسانیت کی مکمل تباہی اور اس کی طرف سے مایوسی کا اعلان۔ "اسلامی اخلاقیات" کے یہ دعوے دار کیا واقعی ذہنی طور پر اس درجہ مفلوج ہیں کہ سوویت یونین میں انسانی معاشرت کے منھ پر کالک ملے بغیر اور انسان کی توہین کئے بغیر اپنے مقصد کی طرف لوگوں کو آواز نہیں دے سکتے؟

میری نظر سے بھی وہ تمام کتابیں گزری ہیں جن کے حوالے یہاں پر دئے گئے ہیں۔ لیکن کئی اہم حوالے اس قسم کے ہیں، جیسے قرآن سے لاتقربوا الصلوٰۃ[۱]

---

[۱] لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سُکاریٰ : نماز کے قریب نہ جاؤ اس وقت جب تم نشے میں ہو۔

کا ٹکڑا بے سیاق و سباق نکال کر یہ ثابت کرنا کہ خود قرآن میں نماز کے خلاف حکم موجود ہے۔

بددیانتی اور بے ایمانی کے اس پورے پلندے میں[1] اصل نقطہ جس سے یہ تمام خطوط کھینچے گئے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ — وہ معاشرہ جس میں اخلاقی نظام اوپر سے نہ آیا ہو، بداخلاق ضرور ہوگا۔ اور جس ضابطے کے لئے قدم قدم پہ خدا کا واسطہ نہ دیا گیا ہو۔ وہ ضابطہ پاک وصاف کیسے رہ سکتا ہے، کیسے چل سکتا ہے۔

بلاشبہ اینگلز نے ہی لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک ایسا اخلاق جو انسانی معاشرے سے باہر کسی مابعد الطبعی ہستی سے اخذ شدہ ہو کوئی وجود نہیں رکھتا۔ لیکن اخلاقی نظام تو انسانی معاشرے کو کامیابی سے چلانے کے لئے اور اجتماعی بہبودی کو سامنے رکھ کر ہی ترتیب پاتا ہے۔ خواہ آپ اسے فرمانِ خداوندی بتائیں یا اسٹیٹ کا مروّجہ قانون۔

آج سوویت یونین میں کسی اشتراکی نوجوان کے سامنے جھوٹ، ریاکاری، مکاری، رشوت خوری، ماتحتوں پر تشدّد، جنسی بے راہ روی والدین سے بے رخی اور اسی قسم کی اخلاقی برائیوں کو برائی یا گناہ ثابت کرنے کے لئے بالکل ضروری نہیں کہ آسمانی کتابوں کے حوالے یا پیغمبروں کے

---

[1] یہ غیر ثقہ الفاظ میں بار بار اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ اگر ممکن ہو تو وہ ان جملوں پر مُصنّف یا اس تصنیف کو عدالت کے سامنے لائیں اور مجھے جواب دینے کا موقع ملے۔

اقوال سنائے جائیں۔ محض اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ اخلاقی گراوٹیں ہیں کیوں کہ ان سے انسانی معاشرے میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور اسی لئے قانون کی گرفت میں آتی ہیں۔ صرف یہ ایک دلیل اس کے نزدیک مذہبی احکام سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں اور بہت سی باتیں ہیں جو قانونی گرفت میں بھی نہیں آتیں لیکن اس کے باوجود انھیں اشتراکی سماج میں بدتر از گناہ سمجھا جاتا ہے۔ کام کے اوقات میں شراب پینا قانونی جرم نہیں ہے لیکن اخلاقی ضابطہ اسے برداشت نہیں کرتا اور نشے کی حالت میں کام پر آنے والوں کو نہ صرف یہ کہ اپنے ساتھیوں کی نظر میں عزت آبرو سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں بلکہ کئی مثالیں خود میرے دیکھتے دیکھتے سامنے آئیں جن میں بڑے عہدے داروں کو ان کے منصب سے اور پارٹی کے ذمہ دار کارکنوں کو ممبری سے محروم ہونا پڑا۔

ایک بیوی کے موجود ہوتے کسی دوسری عورت سے جسمانی تعلقات قائم کرنا قانونی گرفت میں نہیں آتا۔ لیکن بہ یک وقت چار چار بیویوں اور کئی کئی کنیزوں کا دم بھرنے والوں کی سمجھ میں یہ بات مشکل سے آئے گی کہ صرف اس اخلاقی بےراہ روی کی بدولت نہ جانے کتنے کمیونسٹ کارکنوں اور ذمہ دار افسروں کو ان کے منصب سے محروم کیا گیا ہے اور اسے نہایت رکیک سمجھا گیا ہے۔ بیوی پہ ہاتھ اٹھانے یا توہین کرنے کی توباقاعدہ سخت سزائیں مقرر ہیں۔ معاشی ہمواری، قانونی ضابطوں

اور اخلاقی ماحول کی ہی یہ دین ہے کہ سوویت یونین میں عورت خود کو سماجی اور خاندانی زندگی میں برابر کا شریک اور ذمہ دار محسوس کرتی ہے۔

ماسکو شہر میں ایک کرائے کے مکان میں دو تین مہینے رہنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ شاید ہی کسی ایشیائی ملک میں خاندانی زندگی اس قدر ہموار، متحد اور استوار ہو گی جتنی یہاں ہے۔ یہ بات میں نے خود اپنی مشکلات سے معلوم کر لی۔ ستر لاکھ آبادی کے اس عظیم الشان شہر میں اچھے ریستوراں ۲۵ سے زیادہ نہ تھے جہاں خاندانی زندگی سے محروم یا مجھ جیسے بدیسی لوگ کھانا کھا سکتے تھے۔ دو چار گھنٹے گزار سکتے تھے اور وہاں بھی ایک وقت کا کھانا کھانے میں کئی کئی گھنٹے صرف ہو جاتے تھے کیوں کہ آرڈر کے بعد کھانا تیار کیا جاتا تھا۔ پتہ چلا کہ مقامی باشندے عام طور سے ریستوراں نہیں جاتے۔ وہ ریستوراں میں کھانا کھانے کو بے ضابطگی اور عیاشی سمجھتے ہیں۔ چناں چہ ہوٹلوں میں کھانا کھانے والی عورت کے لئے روزمرہ کی بولی میں ایسا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس سے اس کا اخلاقی طور پر گرا ہونا پایا جاتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ کے کام کرنے والے کمیونسٹ نوجوانوں کو دیکھا کہ وہ شام کو ریستوراں جانے سے کتراتے ہیں اور کام سے نمٹ کر گھر کی طرف دوڑتے ہیں۔ کسی کی ماں انتظار کر رہی ہے، کسی کی بیوی کھانا لئے بیٹھی ہے۔ کسی کی بہنوں کی سالگرہ ہے۔ کسی کو اپنا بچہ بال سینٹر سے لیتے ہوئے گھر جانا ہے۔ میں نے جب کھل کر کئی بار اس کی شکایت کی کہ سارے شہر میں ریستوراں

کے سوا اور کوئی ملنے ملانے، خاطر مدارات یا تبادلہ خیال کرنے کی جگہ نہیں ہے اور وہاں بھی روسی رفیقوں سے ملنا نہیں ہوتا تو سننے والوں کو اس شکایت پر حیرت ہوئی اور جواب ملا کہ ریستوراں تو صرف تیوہار یا کوئی تقریب منانے کی جگہ ہے احباب اور عزیزوں کے مل بیٹھنے کا ٹھکانہ آدمی کا اپنا گھر ہے جہاں خاندانی زندگی کی برکتیں میسّر ہوتی ہیں۔

میری طرح جن لوگوں کی عمر ہوٹلوں میں کٹی ہے وہ اس جواب کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں اور اس سے سوویت سرزمین پر خاندانی زندگی کی نشوونما سمجھی جا سکتی ہے۔

یونی ورسٹی کے ملحقہ انسٹی ٹیوٹ میں میرے ساتھ کام کرنے والی ایک لکچرار خاتون جو عمر میں بھی مجھ سے کم نہ ہوں گی سال بھر تک میرے ہاں شام کے کھانے پر آنے کا وعدہ کرتی رہیں اور نہ آئیں۔ ان کے اس انکاری اقرار پر میں ایک روز برہم ہوا تو پتہ چلا کہ تنہا رہنے والے مردوں کے گھر میں عورتوں کا جانا بے حد معیوب سمجھا جاتا ہے اور چوں کہ وہ خود اخلاقیات کی تعلیم دیتی ہیں اس لئے اخلاقی ضابطے سے ذرا ہٹ کر چلنا ان کو زیب نہیں دیتا اور صاف انکار کی مجال اس لئے نہیں کہ دعوت دینے والا پردیسی ہے اور پردیسی جو یورپ میں رہ چکے ہوں انھیں کسی یورپی عورت سے اس قسم کے جواب کی توقع نہیں ہو سکتی۔ بعد کے کئی واقعات سے ان کے اس قول کی تصدیق ہو گئی اور میں انگشت بہ دنداں رہ گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اخلاقی ضابطو

سے محروم ہونے کا الزام دیا جاتا ہے۔

مرد اور عورت کے باہمی جنسی تعلقات دوسرے تمام متمدن اور صنعتی ملکوں کی طرح یہاں بھی قانون کی طرف سے بے قید و بند ہیں اور تعلق قائم کرنے کے لئے صرف فریقین کا راضی ہونا کافی سمجھا جاتا ہے مگر شادی یہاں جتنی آسان ہے طلاق اتنی ہی دشوار ہے۔ باضابطہ شادی کرنے والوں اور شادی سے بچے پیدا کرنے والوں کو قانون بے حد سہولتیں دیتا ہے اور سماج میں اسے وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اقتصادی بار بڑھنے کے بجائے اور کم ہو جاتا ہے۔ لیکن طلاق کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ عام طور سے طلاق کی عدالتی کارروائیوں میں سال سال بھر لگ جاتا ہے اور مصالحت کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے بار بار چکر کاٹنے والے کئی دوستوں کو ماسکو پہنچ کر شکایت ہوتی ہے کہ یہ کیسا اشتراکی اور ترقی یافتہ سماج ہے جہاں عورت معاشی طور پر اس قدر با اقتدار اور جنسی معاملات میں اس درجہ "تنگ نظر اور قدامت پسند" واقع ہوئی ہے۔ اوّل تو راتوں کے وہ کلب ماسکو میں ناپید ہیں جو جاپان سے لے کر قاہرہ اور دمشق تک اور نیویارک سے لندن اور پیرس تک جسموں کی خرید و فروخت کے اڈّے ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ لڑکیوں کی طرف سے عام طور پر پسندیدگی کی نظر کے بعد پہلی تحقیق یہ کی جاتی ہے کہ مرد شادی شدہ

یا کسی اور عورت سے منسوب تو نہیں ہے اور اگر ہے تو بس فقط۔ یہاں سب سے بڑی کشش شادی کے امکانات میں ہے اور سب سے اہم باقاعدہ ازدواج کا رشتہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ میں اس اشتراکی سماج کی بات کر رہا ہوں جس میں لڑکیاں مردوں کے درمیان آزادانہ پلی بڑھی ہیں اور جس کے ستر لاکھ جوان ابھی پندرہ برس پہلے جنگ میں کام آ چکے ہیں اور عورتوں کی تعداد مردوں کے بہ نسبت دگنی سے زیادہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ غیر قانونی شادی یا مرد عورت کے ساتھ رہنے سے جو بچے ولادت پاتے ہیں ان کو قانون ناجائز قرار نہیں دیتا بلکہ ان کی ذمہ داری اسٹیٹ اپنے سر لے لیتی ہے۔ لیکن یہ عمل جبری نہیں ہے بچے چاہے وہ رجسٹرڈ شادی سے ہوں یا بغیر شادی کے، ماں کی آغوشِ محبت سے محروم نہیں ہوتے۔ وہ زندگی سے اپنا پورا حق اور قانون و ریاست سے تعلیم و ترقی کے پورے موقعے پاتے ہیں۔ البتہ سرکاری طور پر رجسٹرڈ کی ہوئی شادی کے بغیر مرد و زن کی زندگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور ایسی مائیں جو اپنے بچوں سے بے نیاز رہنا چاہیں اشتراکی سماج میں عزت کی مستحق نہیں سمجھی جاتیں۔

ممکن ہے آئندہ کسی موقع پہ مجھے اس سلسلے کے مختلف واقعات لکھنے کی جرأت ہو، لیکن فی الحال میں ایک ہندوستانی لڑکی کے بیان کا ایک حصہ نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں جو حال میں حکومتِ ہند کی

طرف سے ماسکو میں ریڈیو نشریات کے کام پر گئی ہیں اور تن تنہا رہتی ہیں!

"یہ دیش کیا ہے۔ استری پردھان دیش ہے۔ زندگی کی ہر ڈگر پر، گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی عورتوں کا راج دکھائی دیتا ہے۔ گھر کی ساری آمدنی اور خرچ عورت کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بیوی بھی ہو سکتی ہے اور ماں یا نانی دادی بھی۔ معلوم نہیں مرد کہاں رہتے ہیں دن بھر؟ شاید بھاری صنعتوں کے کارخانوں اور فوج میں مردوں کا عمل دخل ہوتا ہو گا ورنہ بس میں، ٹرام میں، ریل پر، ڈاک خانے میں ہسپتال میں، اسکولوں میں، دوکانوں پر، گوداموں میں، دفتروں میں عورتوں کی ریل پیل رہتی ہے۔ اور ان کے ساتھ مردوں کا وہ "نزاکت کی پری" والا برتاؤ بھی نہیں ہے۔

غضب خدا کا، یہاں کی عورتیں تو۔ ہم ہندستانی عورتوں سے بھی بڑھ کر گھر بار کی ٹوہ لیتی ہیں۔ مجھ سے ساری پڑوسی عورتیں ایک ایک کر کے پوچھ چکی ہیں —— تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟ کر لو نا —— شادی کے بغیر عورت کی زندگی نامکمل رہتی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اس مشورے میں بڑی بوڑھیاں اور

نوجوان نیشنل ایبل لڑکیاں سب برابر کی شریک رہتی ہیں.
اور یہ بھی کہتی رہتی ہیں کہ شوہر کے بغیر پردیس میں نہیں
نکلنا چاہیئے"

(ہیم لتا جن سوامی)

یہ اس اشتراکی سماج میں عام عورت کے متعلق ایک ہندستانی لڑکی کے تاثرات ہیں. اور جس نے بھی سوویت یونین کے مختلف شہروں میں رہ کر، لوگوں میں گھل مل کر مرد و زن کے جنسی تعلقات اور اخلاقی ضابطوں کو جاننے اور جانچنے کی کوشش کی ہوگی اس کے تاثرات یہی ہوں گے کہ اس قدر ترقی یافتہ صنعتی سماج، جو اجتماعی طور پر فرمانِ خداوندی اور جہنّم کے اندیشے سے پاک ہے. روزمرّہ کے بیوہار میں ایشیائی ماحول سے بھی زیادہ "مذہبی" ہے. اور گناہ و ثواب کے تصوّر سے بے نیاز ہونے کے باوجود عمل میں بجا اور بے جا، مناسب اور نامناسب کے سخت ضابطوں کو اپنے اوپر عائد کئے ہوئے ہے۔

نوجوان کمیونسٹ لیگ کے نہ جانے کتنے ممبر لڑکوں اور لڑکیوں کو، انسٹی ٹیوٹ کے نہ معلوم کتنے طالب علموں کو اس جرم میں نہیں کہ اُنھوں نے مذہبی احکام کو اپنا شعار بنالیا، بلکہ اس جرم کی پاداش میں خارج کر دیا گیا کہ ان سے جنسی بے راہ روی یا ایسی بداخلاقی

سرزد ہو گئی تھی جو اہلِ مذہب کی خانقاہوں اور آشرموں میں آئے دن ہوتی رہتی ہے۔

ایک تقریب کے موقع پر سوویت کے کسی بھرے گھر میں مجھے اپنی ڈائری کے کچھ ورق ترجمہ کر کے سُنانے کا اتفاق ہوا جہاں ماں، باپ نانی، دادی، بچے، جوان، اعزّا احباب سبھی موجود تھے، جب میں ایک ایسے پیراگراف پر پہنچا جو جماعت اسلامی کے مذکورہ بزرگ کی کتاب سے ماخوذ تھا اور جس میں تحریر تھا کہ جس سماج میں آدمی کو خدا کا خوف اور ثواب کی عظمت کا احساس نہ ہو وہاں نیکی اور پاکیزگی کا کوئی تصوّر نہیں ہو سکتا۔ تو نوجوان اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ انھوں نے کہا۔ تو کیا نیکی اور پاکیزگی وہاں ہوگی جہاں اَن جانے جہنّم کا خوف اور جنّت کا لالچ دے کر لوگوں کو بندھنوں میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہو؟ جہاں پر مذہبی اعتقاد کے مطابق قربانی دے کر گناہ کا کفّارہ ہو جائے اور خیرات دے کر جنّت خریدی جائے۔ وہاں صرف غریبوں، بے بسوں کو ہی مذہب کی گرفت میں رکھا جا سکتا ہے اور کیا اس جبریہ گرفت کو اب تک بعض لوگ نیکی اور پاکیزگی سمجھتے ہیں۔

جس سادگی اور معصومیت کے ساتھ یہ جواب نوجوان اشتراکیوں کی زبان سے نکلا وہ سادگی اور معصومیت صرف لفظی نہیں بلکہ سوویت یونین کے ایک سرے سے دوسرے تک عام ہے اور انسانی اخلاق کے لئے خوش آئند۔